وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمتِ قرآن لاہور

جلد ۴۳ شمارہ ۱

رجب المرجب ـ رمضان المبارک ۱۴۴۵ھ جنوری ـ مارچ ۲۰۲۴ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ـــ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہما

مدیر مسئول: ڈاکٹر عارف رشید

مدیر:
ڈاکٹر ابصار احمد

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

مجلسِ ادارت:
حافظ عاکف سعید ـ حافظ عاطف وحید
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ ـ مؤمن محمود
پروفیسر حافظ قاسم رضوان

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور ـ فون 3-35869501
ویب سائٹ : www.tanzeem.org
ای میل: publications@tanzeem.org
سالانہ زرِ تعاون: 500 روپے، فی شمارہ: 125 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

رمضان المبارک: علم وایمان کا ریفریشر کورس	ڈاکٹر ابصار احمد	3

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۳۵)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	9

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	پروفیسر حافظ احمد یارؒ	20

فکر ونظر

الفاظ کی جادوگری کا فتنہ	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	31

قرآنیات

تفسیر موضح القرآن	ڈاکٹر عظمیٰ خاتون	41

فکر وفلسفہ

عقیدہ سے ہم آہنگ نظریہ سازی اور علم الکلام	مکرم محمود	51

تعلیم وتعلّم

مباحثِ عقیدہ (۱۷)	مؤمن محمود	59

اخبارِ کُلیہ

سالانہ تقریب ختم بخاری شریف	مرتضیٰ احمد اعوان	75

اسلام اور سائنس

سائنسی علوم کی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت	ڈاکٹر محمد رفیع الدین	78

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	82

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رمضان المبارک: علم و ایمان کا ریفریشر کورس

ڈاکٹر ابصار احمد

’’حکمتِ قرآن‘‘ کا یہ شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں مطالعے کے لیے رمضان المبارک کے آغاز میں پہنچے گا‘ چنانچہ اسی حوالے سے یہ سطور قلم بند کی جا رہی ہیں۔ روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے جس کی فرضیت قرآن کریم کی سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ بالصراحت بیان کرتی ہے۔ آیت شریفہ اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٨٥﴾﴾

’’رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے‘ اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق اور باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے‘ اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے‘ سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔‘‘

روزہ کی عظمت و فضیلت کا بیان کئی احادیث رسول ﷺ میں وارد ہوا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک مشہور حدیث جو صحیح مسلم (کتاب الصیام‘ باب فضل الصیام) میں درج ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

’’ہر انسان کے (نیک) عمل کو دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مگر روزے کا معاملہ دیگر نیکیوں سے مختلف ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ میری وجہ سے وہ اپنی خواہشات اور کھانا پینا چھوڑتا ہے۔ روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی اس کے افطار کے وقت اور ایک خوشی اپنے ربّ کی ملاقات کے وقت۔ اور یقیناً اس کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک کستوری کی خوشبو سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔‘‘

اس حدیث کی متفق علیہ روایت کے قدسی حصہ کا مفہوم ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ ''روزہ تو بس میرے لیے ہے اور اس کا اجر بھی بس میں ہی دوں گا''۔ یہ کس قدر پیار اور قدر افزائی کے الفاظ ہیں! شارحین نے اس حدیث کے بہت سے مطلب بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو ہو سکتا ہے صحیح ہوں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصلاً یہ تو ایک ادا کے پسند آ جانے کا ذکر ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث کے الفاظ ہیں: یَدَعُ شَھْوَتَہٗ وَطَعَامَہٗ مِنْ اَجْلِیْ۔ ''وہ میری خاطر اپنی خواہش اور کھانے پینے سے دست کش رہتا ہے۔ مِنْ اَجْلِی ''میری خاطر!'' اس کی ساری اہمیت تو بس اسی لفظ میں ہے کہ ''میری خاطر''۔ جب ہمارا خالق و مالک اتنے التفات اور قدر دانی کا اظہار کر رہا ہے تو پھر ہم مسلمانوں کو یہ چند گھنٹے کی مشقت پورے اخلاص کے ساتھ صرف اسی کے لیے کرنی چاہیے۔ اس کو نری عادت اور سالانہ رسمیاتی معمول نہیں بلکہ واقعی عبادت ہونا چاہیے اور صوم کی تمام شرائط و ضوابط اور آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ توفیق اور قبولیت کے لیے ہم سب خدا کے دَر کے محتاج ہیں۔ ایک وہی ہے جس کے دَر سے تہی دست لوٹ آنا محال و مستحیل ہے۔

تمام اہلِ اسلام رمضان المبارک کے دو متوازی پروگراموں سے بخوبی واقف ہیں: دن کا روزہ اور رات کا قیام۔ چنانچہ کُتب احادیثِ نبویہ سے مندرجہ ذیل دو احادیث اس پر شاہد ہیں۔ قیام اللیل میں تراویح کی رکعات میں قرآن کریم کی سماعت از اول تا آخر عمل متواترہ کے طور پر اُمّتِ مُسلمہ میں جاری ہے۔ پہلی متفق علیہ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ : مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ، وَمَنْ قَامَ لَیْلَۃَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت یا اللہ ہی سے اجر کی امید کے ساتھ' بخش دیے گئے اس کے تمام سابقہ گناہ' اور جس نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت یا اللہ ہی سے اجر کی امید کے ساتھ' بخش دیے گئے اس کے جملہ سابقہ گناہ' اور (اسی طرح) جس نے قیام کیا شب قدر میں ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت یا اللہ ہی سے اجر کی اُمید کے ساتھ اس کے بھی تمام سابقہ گناہ بخش دیے گئے۔''

رمضان کے حوالے سے حکمتِ نبوی کی دوسری حدیث کا موضوع روزہ اور قرآن کی شفاعت کے بارے میں ہے اور اس طرح یہ بھی دن اور رات کے دو الگ الگ اعمال کی طرف واضح اشارہ ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اَلصِّیَامُ وَالْقُرْاٰنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ، یَقُوْلُ الصِّیَامُ: اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ، وَیَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ: مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ

فِيْهِ، فَيُشَفَّعَانِ (رواہ احمد والطبرانیؒ والبیہقیؒ)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”روزہ اور قرآن دونوں قیامت کے دن بندے کی سفارش کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو دن میں کھانے پینے اور نفس کی خواہشات پورا کرنے سے روکے رکھا تھا‘ آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اس کو رات کو سونے اور آرام کرنے سے باز رکھا تھا‘ آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش (اس بندہ کے حق میں) قبول فرمائی جائے گی (اور اس کے لیے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا)!“

رمضان المبارک کے دوگانہ دستور العمل میں سے پہلے حصے یعنی دن کے روزے سے لوگ بالعموم خوب واقف ہیں اور حسب توفیق دین دار مرد و خواتین اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ البتہ دوسرے حصے یعنی قیام اللیل بشکل نماز تراویح کو اکثریت بس ایک بے جان رسمی عبادت (ritual) کے طور پر سرانجام دیتی ہے‘ جس کے لیے کم سے کم وقت میں بیس تراویح کو ختم کرنے والے قاری صاحب اور مسجد کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی بدبختی اور فہم دین کے فقدان کا شاخسانہ ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ بس کلچرل sense میں مسلمان ہوتے ہوئے اللہ کے تعارف سے محروم اور بندگی کے پُرلطف معنوں سے ناآشنا رہتے ہیں۔

برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے تحریک رجوع الی القرآن کے ضمن میں اس مبارک ماہ اور قرآن کے اسی تعلق کو مسلمانوں میں دینی شعور‘ قرآن کے انسانیت کے لیے پیغام کو بڑے پیمانے پر نشر اور معرفتِ ربّانی کے لیے ہر رات کو تراویح کی نماز کے ساتھ پڑھے جانے والے کلام پاک کے حصے کا ترجمہ اور مختصر تشریح کا سلسلہ آج سے چالیس سال قبل یعنی ۱۹۸۴ء میں قرآن اکیڈمی لاہور کی مسجد جامع القرآن میں شروع کیا جو رات کو چار پانچ گھنٹوں تک جاری رہتا تھا۔ ان کا یہ احساس درست ثابت ہوا کہ یہ ماہ اپنے اندر انسان کے لیے اللہ کے تعارف اور قرآن فہمی کے حوالے سے بہترین امکانات اور اوقات لیے ہوئے ہے۔ روزہ اس بات کا اعلان ہے کہ دنیا میں خدائی غذائی اجناس کی نہیں بلکہ روٹی پیدا کرنے والے اور دینے والے کی ہے۔ وہ کبھی بھوکا بھی رکھے تب بھی خدائی اُسی کو زیبا ہے۔ ایک مسلمان کا ہر حال میں اُس ذاتِ حق سے اپنا ایک رشتہ ہے جو بندگی اور سپاس پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ منعم شناسی ہی دراصل خود شناسی ہے۔ انسانوں کی طرح کھانا‘ کسی سوچے سمجھے مقصد کے لیے کھانا بلکہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے کبھی نہ بھی کھانا..... پھر کھانے اور نہ کھانے ہر دو صورت میں بندگی کا اقرار اور اعتراف کرنا‘ بلکہ نہ کھانے کی صورت میں شکم سیروں سے کہیں بڑھ کر رب تعالیٰ کی حمد و تسبیح کرنا‘ بھوکا اور پیاسا رہ کر اپنی بندگی اور اس کی کبریائی کا زیادہ شدت سے اعتراف کرنا ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ہاں درجۂ کمال میں نظر آتا ہے۔ انسان اور دیگر مخلوقات کا یہ فرق ہمیں کلام پاک میں سورۂ محمدؐ کی اس آیت میں بتایا گیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝١٢﴾

''خالق سے کفر کرنے والے بس کھاتے ہیں' چند روزہ زندگی کی موج کرنے میں لگے ہیں' یوں کھاتے ہیں جیسے جانور' اور آگ ان کا گھر (بننے کے انتظار میں) ہے۔''

ہمیں افسوس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑ رہا ہے کہ اسلامیت اور ایمانی وروحانی ترفع کے اعتبار سے ہماری عظیم اکثریت کا معاملہ دگرگوں ہے۔ ایمان کے جس منبع و سرچشمہ یعنی قرآن حکیم کو ہمارے لیے ایک پاکستانی نژاد برطانوی ☆ مسلمان پروفیسر آف فلاسفی کے فکر انگیز الفاظ میں نہ صرف oral and aural presence بلکہ انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے ہادی ورہنما ہونا چاہیے تھا' وہ ہماری توجہات سے باہر ہے۔ اس پر غور وتفکّر تو کجا' ہم اس کی تلاوت بھی کم کم ہی کرتے ہیں۔ بلادِ اسلامیہ کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص دو حوالوں سے عصری فلسفیانہ لٹریچر میں پائے جانے والے افکار سے متاثر ہوکر وحی پر مبنی دین کے مسلمات ہی کو چیلنج کرنا شروع کر دیتا ہے۔

گزشتہ صدی کے نصفِ اول کو مغرب میں فکر و فلسفہ اور منہاجیات میں وہ جدیدیت جو نشاۃ ثانیہ اور تحریکِ تنویر سے شروع ہوئی تھی' کا آخری اور مکمل ترین مرحلہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کے بعد ''پس جدیدیت'' (post-modernity) کا اندازِ فکر لیے ہوئے دانشور اور تصانیف ہمارے مطالعے میں آتی ہیں۔ ماقبل پیراگراف میں جن دو مؤثر حوالوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ انہی دو ادوار سے منسلک ہیں اور اسلام کے فکری پیراڈائم سے نہ صرف تعارض رکھتی ہیں بلکہ ان کے مابین بُعد المشرقین ہے' کیونکہ یہ دورِ حاضر کے مائنڈ سیٹ یا بالفاظِ دیگر جاہلیتِ جدیدہ کے بنیادی تصورات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اوّل الذکر دور کے نمائندہ مفکّر کے طور پر برٹرینڈ رسل کو لیا جاسکتا ہے جس کی طویل عمر کے دوران لیکچرز اور تصانیف کے اثرات دنیا بھر میں پھیلے ہیں۔ اس کے نظامِ فکر کے مختلف گوشے ہیں' لیکن اس نے بالخصوص تعلیم کے مقاصد' تنقیدی فکر کی اہمیت اور منہاجیات پر بھی جا بجا خیالات کا اظہار کیا ہے جن میں ایک اہم نکتہ value of uncertainty (یعنی تشکیک اور غیر یقینی ذہنی وعلمی کیفیت کی اہمیت اور قدر و قیمت) ہے جسے بعض اہل قلم نے رسل کی متعدد نگارشات سے منتخب کر کے "A Liberal Decalogue" (یعنی لبرل ازم کے احکامِ عشرہ باندازِ شریعت موسوی کے احکامِ عشرہ) کا عنوان دیا ہے۔ ان دس احکام میں سب سے پہلا اور اہم ترین یہ ہے:

Do not feel absolutely certain of anything.

قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس طرح یہ اصول ایک طرف تاریخ انسانی میں وحیٔ ربانی اور پیغمبروں کے اقوال وافعال پر مشتمل دینی روایت پر تیشہ بن کر گرتا ہے' تو دوسری جانب انسانوں میں حتمیت اور قطعیت والا یقین وایقان جو ایک ناگزیر فطری ضرورت ہے' کی نفی اس سے ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کی جامعات میں اعلیٰ

☆ یہاں اشارہ ڈاکٹر شبیر اختر کی اہم کتاب The Quran and the Secular Mind کی طرف ہے جسے معروف پبلشر Routledge نے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا۔

تعلیم حاصل کرنے والے مسلم نوجوانوں کی کثیر تعداد برٹرینڈ رسل اور اس سے ملتے جلتے خیالات پیش کرنے والے مفکر کارل پوپر سے متاثر ہو کر مذہبی اذعان و ایقان کو شک اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ دانشِ غرب کے زائدہ افکار نے انسان کے اعتماد‘ خدا پر ایمان‘ زندگی بسر کرنے کے لیے کسی ضابطے‘ راستے اور عقیدے سب کو نہ صرف ٹھیس پہنچائی ہے بلکہ انہیں کمزور اور نامعقول (irrational) اور لغو (absurd) قرار دے کر انسان کو تشکیک اور تذبذب میں مبتلا کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح علامہ اقبال نے بہت پہلے اس صورت حال کو بھانپ کر اس کی صحیح نباضی کی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

علم حاضر پیش آفل در سجود　　　شک بیفزود و یقیں از دل ربود

(جدید علم‘ غروب ہونے والوں کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ یہ انسان کو شک و شبہ میں مبتلا کرتا اور یقین و اعتماد دلوں سے رخصت کرتا ہے)

اور اسی لیے آج کا انسان ’’بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم‘‘ کی کیفیت سے دوچار ہے۔

اب آیئے دوسرے فکری عامل کی طرف! مابعد جدیدیت کی عصری فکریات اور فلسفہ علومِ عمرانی میں کثیر المدنیت یا multiculturalism کو آج کل قبولِ عام حاصل ہے‘ جس کے جملہ اصولوں میں اہم ترین سلوگن ایک مشہور مصنف نے اس طرح پیش کیا ہے:

Beware of dichotomies; Avoid pernicious dualisms; Think dialectically.

مغربی دانشوروں کی تحریروں کا سحر اور علمیات کے میدان میں اس اپروچ کا اثر بڑے پیمانے پر ہمارے ہاں کے روشن خیال قلم کاروں نے بھی قبول کیا ہے۔ چنانچہ اس قبیل کے خواتین و حضرات اپنے اس فکر کو بڑی شد و مد کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں کہ ہمیں ہر معاملے میں binary اور exclusivist انداز کی بجائے سب سے کمپرومائز اور ایڈجسٹمنٹ (مصالحت و مفاہمت) کر کے چلنا چاہیے‘ جبکہ امر واقعہ ہے کہ ایک مسلمان جو قرآن و حدیث کے محکمات پر یقین رکھتا ہے‘ ہرگز اس پالیسی کو اختیار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس کی پوزیشن اس شعر کے مطابق ہوتی ہے: ؎

باطل دوئی پسند ہے‘ حق لا شریک ہے　　　شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول!

حقیقت یہ ہے کہ حق و باطل‘ خیر و شر اور عدل و ظلم کے مفاہیم اور تصورات (Categories, Notions) متضاد اور متخالف ہیں اور ان کو خلط ملط کرنے کی اجازت قانونِ خداوندی ہرگز نہیں دیتا۔ حق پرستوں اور کفر و عدوان کے پرستاروں کے درمیان polarization کو کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا اگر ممکن ہوتا تو رحمت للعالمین ﷺ کے عہدِ رسالت میں یقیناً ہو چکا ہوتا‘ جبکہ سیرت طیبہ کے تاریخی حقائق گواہ ہیں کہ دین اسلام اور کفر کے نظام کا فرق اور حق و باطل کی کشمکش آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات تک جاری رہی۔ شک و شبہ اور غیر قطعیت کو ایک اعلیٰ علمی قدر اور رویے کے طور پر اپنانے کا نتیجہ عملاً ’’جاہلیتِ جدیدہ‘‘، لبرل ہیومن ازم‘ حق سے روگردانی اور اھواء اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی صورت میں ہر ہوش مند اور دیدۂ بینا رکھنے والا شخص دیکھ سکتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں

پڑھائے جانے والے فلسفہ و دانش کا معاملہ بھی انتہائی مایوس کن ہے جسے مغرب کے بعض سنجیدہ مفکر خود بھی محسوس کرتے ہیں۔ واقعتاً نام نہاد مفکّرین کی کیفیت قرآن کے الفاظ میں ﴿اَلَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ خَوۡضٍ یَّلۡعَبُوۡنَ﴾ ''وہ حق کی تکذیب اور استہزاء اور بیہودہ گوئی میں اچھل کود کر رہے ہیں'' (ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی) کی تصویر ہے۔ اس کی تصویب خود ایک اہم برطانوی فلسفی الیسڈیئر میکنٹائر نے ان الفاظ میں کی ہے کہ اب فلسفیوں کے پاس لسانی تحلیل وتجزیہ بعنوان Language games اور Epitaph writing (لوحِ مرقد پر لکھے جانے والے چند الفاظ اور مختصر عبارت) کی تحریر کا کام رہ گیا ہے۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کو قرآن حکیم میں دیے گئے علم وحکمت اور ابدی اور غیر مبدل ہدایت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ چنانچہ علامہ اقبال کا یہ شعر ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

جہاں ایک طرف نویدِ جاں فزا ہے، تو ساتھ ہی دعوتِ فکر اور دعوتِ عمل بھی ہے کہ قرآن کریم کی دی ہوئی روشنی اور نور سے ہم تشکیک اور ارتیابیت کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم دکھائیں۔

قرآن کریم کی دو آیات: ﴿فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (محمد:۱۹) اور ﴿فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوۡلٰىكُمۡ﴾ (الانفال:۴۰) کے حوالے سے واضح ہے کہ ہمارے دینی تصوّرات میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا مرکزی و بنیادی عقیدہ پختہ علم اور تفصیلی دلیل کی روشنی میں ہونا ضروری ہے تاکہ اس عقیدے کے ثمرات ظاہر ہوں۔ اس میں شک کا خلجان اور نفس کا تردّد نہ رہے، اور یہ ایمان اور عقیدہ جویانِ حق اور تشنگانِ علم کے وجودی احوال میں متحقق ہوکر ان کے خلاق و اعمال کو نہ صرف قرآن وسُنّت کے قالب میں ڈھال دے بلکہ وہ دینی تعلیمات و اقدار کے داعی بھی بن جائیں، اور اس طرح تہذیب اور معاشرے کی سطح پر حقیقی اور دیرپا تبدیلی کا باعث بنیں۔ محولہ بالا دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ کے بطور الٰہ، مولیٰ اور معبود کا علم حاصل کرنا صیغہ امر میں آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ از روئے قرآن اللہ کو خالق و مالک اور معبود و مسجود ماننا پورے تیقن اور علم و عرفان کی روشنی کے ساتھ تاکیداً مطلوب ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمارے دینی معتقدات اندھے اور بے عقل تصوّرات (dogmas) نہیں بلکہ تعقل، بصیرت و عرفان اور فقہ عمیق پر مبنی ہیں جو تنزیل ربّانی کی تابانی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ محض محدود انسانی حواس اور استنباطی عقل کے زائیدہ نہیں ہیں۔ قرآن وسُنّت سے کشید کردہ علم ہی ہمارے سلف صالحین کے نزدیک ''العلم'' ہے، یعنی صحیح اور مکمل معنوں میں علم ''العلم'' ہی ہے، جبکہ انسانی حیاتِ دنیوی کے مسائل، تفہیم اور ان کے حل کے ذرائع و وسائل کی دریافت وتدریس محض علم بلکہ اس سے بھی کم تر فنون یا مہارتوں (skills) کے درجے کی چیزیں ہیں، جن سے باطنی نور، حکمت خالدہ اور علم حقیقی کا سرے سے کوئی واسطہ نہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ علمائے اُمّت، بالخصوص برادر بزرگ ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی قائم کردہ انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے تمام اہلِ علم وابستگان کو اس مبارک کام اور فریضے کو کماحقہ ادا کرنے کی توفیق ارزانی کریں۔ آمین!

۞۞۞

مِلاکُ التأوِیل (۳۵)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی

تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃُ الاسراء

(۲۲۷) **آیت ۹۴**

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾﴾

’’اورلوگوں کو ایمان لانے سے کس چیز نے روک رکھا ہے جب کہ ہدایت ان کے پاس آگئی تھی اِلّا یہ کہ انہوں نے کہا: کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟‘‘

اور سورۃ الکہف میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾﴾

’’اورلوگوں کو ایمان لانے سے کس چیز نے روک رکھا ہے جب کہ ان کے پاس ہدایت آگئی اور (اسی طرح) اپنے ربّ سے استغفار کرنے سے بھی، اِلا یہ کہ کہیں ان کے ساتھ بھی اگلے لوگوں جیسا معاملہ پیش نہ آجائے یا ان کے سامنے کھلم کھلا عذاب نہ آجائے (یعنی اہلِ مکّہ اس انتظار میں ہیں کہ پہلے یہ دیکھ لیں کہ ان کے ساتھ پچھلے لوگوں جیسا معاملہ ہوتا ہے یا ان پر عذاب آتا ہے، تب کہیں جا کر وہ ایمان لائیں گے)۔‘‘

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۃ الکہف کی آیت میں تو استغفار کرنے کا بھی ذکر ہے جبکہ سورۃ الاسراء کی آیت میں گو مضمون وہی ہے لیکن استغفار کا ذکر نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے، واللہ اعلم، کہ سورۃ الاسراء کی آیت سے قبل کُفّار کے عناد، کفر پر اصرار کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ سورۃ الکہف میں نہیں ہے۔ سورۃ الاسراء میں پہلے یہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾﴾

’’اور ہم نے لوگوں کے (سمجھنے کے) لیے اس قرآن میں طرح طرح کی مثالیں بیان کی ہیں، لیکن اکثر لوگوں نے انکار ہی کیا ہے۔‘‘

اور اس کے بعد قریش کے انتہائی گمراہ کن لوگوں کے مطالبات کا ذکر کیا کہ جب تک تم یہ مطالبات پورے نہ کرو گے ہم ایمان نہ لائیں گے۔ اس کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے:

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾ ﴾

''اورانہوں نے کہا: ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ آپ ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ نہ جاری کردیں۔''

یہ کُل آٹھ مطالبات تھے' آخری یہ تھا کہ ہمارے اوپر ایک کتاب نازل کریں جسے ہم پڑھ سکیں۔

گویا انہوں نے ایمان نہ لانے کی قسم اُٹھا رکھی تھی' اس لیے ناجائز مطالبات کا ڈھیر لگا دیا۔تو یہاں استغفار کا ذکر مناسب نہ تھا۔ استغفار کا ذکر عموماً وہاں ہوتا ہے جہاں گناہ ہوتے ہوں لیکن اتنے نہیں کہ کفر کی حد تک پہنچ جائیں۔ جہاں کفر کا کھلا چرچا ہوتو وہاں استغفار کا ذکر بے محل ہے۔

سورۃ الکہف کا سیاق وسباق دیکھ لیں' یہاں ان کے عناد اور تلخیٔ گفتار کا اتنی شدت سے ذکر نہیں ہے جتنا کہ سورۃ الاسراء کی آیت میں ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو' سورۃ الکہف کی آیت سے قبل ارشاد ہوا:

﴿ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾ ﴾

''اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر مثال کو طرح طرح سے بیان کیا۔لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔''

اس کے مقابلے میں سورۃ الاسراء کی اسی آیت کے آخر میں زیادہ سخت الفاظ لائے گئے ہیں۔ ارشادفرمایا:

﴿ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٨٩﴾ ﴾

''لیکن اکثر لوگوں نے انکار ہی کیا ہے۔''

سورۃ الاسراء میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا گیا ہے کہ انسان خوب جدال (جھگڑا) کرتا ہے۔''جدال'' کیا ہے؟ یہی نا کہ ایک معاملے کے دو رُخ ہوتے ہیں اور انسان اپنی رائے کو بالمقابل رائے کی نسبت زیادہ درست سمجھتا ہے' اس لیے اپنی رائے کے دفاع میں اپنی حجت پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود نبی ﷺ کو مخالفین کے ساتھ جدال کا حکم دیا ہے لیکن خوش اسلوبی کے ساتھ۔ فرمایا:﴿ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ ۭ ﴾ (النحل:١٢٥) مراد یہ ہے کہ ان کے ساتھ نرمی کے ساتھ بات کرو' صبر اور تحمل کی روش اختیار کرو۔ اب جبکہ سورۃ الکہف کا اندازِ بیان سورۃ الاسراء کے مقابلے میں کچھ نرم ہے اس لیے مناسب تھا کہ وہاں ایسے لوگوں کے لیے استغفار کا ذکر کیا جاتا۔ گو بات دونوں جگہ کُفّار ہی کی ہورہی ہے لیکن اندازِ بیان کے اختلاف کی وجہ سے جہاں نرمی پائی گئی وہاں استغفار کا بھی ذکر کردیا اور جہاں ان کے اوصافِ کفر میں شدت پائی گئی وہاں استغفار کا ذکر چھوڑ دیا۔ واللہ اعلم!

(٢٢٨) آیت ٩٨

﴿ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا ﴾

''یہ ان کا بدلہ تھا' اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا''

اور سورۃ الکہف کی آیت میں ارشادفرمایا:

﴿ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾ ﴾

’’یہ ان کا بدلہ ہے جہنم‘ اس لیے کہ انہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور ہمارے رسولوں کا مذاق اڑایا۔‘‘

سوال یہ ہے کہ یہاں بدلے کے طور پر جہنّم کا صریح ذکر کیا گیا‘ لیکن پہلی آیت میں جہنّم کا ذکر نہیں ہے‘ حالانکہ دونوں آیات کا معنیٰ و مطلب ایک ہی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الاسراء کی آیت سے قبل جہنّم کا ذکر آ چکا تھا‘ فرمایا:

﴿وَنَحۡشُرُهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوۡهِهِمۡ عُمۡيًا وَّبُكۡمًا وَّصُمًّا ؕ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ﴾ (آیت ۹۷)

’’اور قیامت کے دن ہم انہیں اوندھے منہ اٹھائیں گے اور حال یہ ہوگا کہ وہ اندھے‘ گونگے اور بہرے ہوں گے‘ ان کا ٹھکانا جہنّم ہوگا۔‘‘

اس آیت میں ان کی سزاؤں کا بیان کیا گیا اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ بالآخر ان کا ٹھکانا جہنّم ہوگا‘ تو اس کے بعد کی آیت میں ’’ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ ‘‘ کہہ کر ان تمام باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا جن کا ذکر پہلے آ چکا تھا۔

جہاں تک سورۃ الکہف کی آیت کا تعلق ہے تو اس آیت سے کافی پہلے دو دفعہ جہنّم کا ذکر آ چکا ہے۔

پہلے آیت ۱۰۰ میں: ﴿وَّعَرَضۡنَا جَهَنَّمَ يَوۡمَئِذٍ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ عَرۡضَا ۙ﴿۱۰۰﴾﴾

’’اور اس دن ہم جہنّم کو کافروں کے سامنے پیش کریں گے۔‘‘

پھر آیت ۱۰۲ میں: ﴿اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾﴾

’’اور بے شک ہم نے کافروں کی مہمانی کے لیے جہنّم کو تیار کر رکھا ہے۔‘‘

اس کے بعد تین اور آیات ہیں:

﴿قُلۡ هَلۡ نُـنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ﴿۱۰۳﴾﴾

’’کہو: کیا ہم تمہیں بتا دیں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہوگا!‘‘

﴿اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾﴾

’’یہ وہ لوگ ہیں کہ دُنیوی زندگی میں ان کی ساری کاوشیں ضائع ہو گئیں اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔‘‘

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا ﴿۱۰۵﴾﴾

’’یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا بھی انکار کیا اور اس سے ملنے سے بھی! تو ان کے سارے اعمال غارت ہو گئے اور ہم قیامت کے دن ان کا کوئی وزن نہ رکھیں گے۔‘‘

اب اس آیت کے بعد وہ آیت ہے کہ جس میں ان کی جزا بتائی جا رہی ہے‘ اور یہاں صرف اسم اشارہ کافی نہ تھا‘ کیونکہ جہنّم کے ذکر کے بعد تین آیات آ جانے کی وجہ سے کافی بڑا فصل واقع ہو گیا تھا‘ اس لیے جہنّم کا ازسرِنو ذکر کرنا مناسب تھا۔ اسی لیے ارشاد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوۡا وَاتَّخَذُوۡۤا اٰيٰتِىۡ وَرُسُلِىۡ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾﴾

یوں واضح ہو گیا کہ سورۃ الکہف کی آیت میں لفظ جہنّم کا اعادہ کرنا بالکل موزوں تھا۔ واللہ اعلم!

سُورَۃُ الکَھف

(۲۲۹) آیت ۲۲

﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ﴾

''عنقریب وہ کہیں گے کہ وہ تین تھے چوتھا ان کا کتّا تھا' اور کہیں گے کہ وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتّا تھا (اور یہ کہنا صرف) اٹکل کے تیر کی مانند تھا کسی نامعلوم چیز کے بارے میں' اور کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتّا تھا۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آٹھ کے عدد کے ساتھ ''واوٗ'' کا آنا ایک خصوصیت رکھتا ہے اور کیا وہ اس سے قبل جو نکرہ آیا ہے اس کی صفت ہوسکتا ہے جیسا کہ پہلے دونوں اقوال کے ساتھ آیا ہے' لیکن وہاں تو ''واوٗ'' نہیں تھا' تو آٹھ عدد (وَّثَامِنُهُمْ) کے ساتھ ''واوٗ'' لانے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا سب سے واضح جواب یہ ہوسکتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ یہ بتا رہے ہیں کہ یہود میں اصحابِ کہف کے عدد کے بارے میں اختلاف پایا جاتا تھا اور ان میں سے اکثر ان کا صحیح عدد نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو ان کے اقوال بتائے اور اس کے بعد اشارتاً وہ قول بتایا جو صحیح ترین تھا۔ بطور وضاحت عرض ہے: ''سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ'' یعنی هُمْ ثَلَاثَةٌ : وہ تین ہیں۔ ''رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ'' یہ ''ثَلَاثَةٌ'' کی صفت ہے اور عربی قاعدے کے مطابق پورا جملہ نکرہ کی صفت واقع ہوسکتا ہے' اور اگر پہلے معرفہ ہو تو اس کا حالیہ جملہ بن سکتا ہے۔ ''خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ'' یہاں پہلے کی طرح ''خَمْسَةٌ'' نکرہ ہے اور اس کے بعد کا جملہ اس کی صفت ہے۔ ''رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ'' یہ جملہ حالیہ ہے اور بتا رہا ہے کہ پہلے دونوں قول اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں کرنے کے مترادف ہیں' اور انہیں حقیقت کا علم نہیں ہے۔ ''وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ'' اور یہ جملہ چونکہ ''رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ'' کے بعد آیا ہے تو گویا یہ بتایا جارہا ہے کہ پہلے کی بات تو اٹکل پچّو والی تھی لیکن اب سنو کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتّا تھا۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ ''واوٗ'' لاکر یہ بات سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ''وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ'' سے ایک نیا جملہ شروع ہورہا ہے اور اس کا پچھلے دو اقوال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ توجیہہ ابن عباس ؓ اور کئی دوسرے قابلِ اعتماد مفسرین کی بھی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ سیبویہ نے ذکر کیا ہے کہ عرب اکثر ایک بات کو حذف کر دیتے ہیں اور اشارتاً محذوف کلام کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کسی چرواہے سے ناراض ہے اور بددعا کے طور پر کہتا ہے: اَللّٰهُمَّ ضَبْعًا وَذِئْبًا ''اے اللہ! لگڑ بگڑ اور بھیڑیا!!'' اور اگر اس سے پوچھا جائے کہ تمہارا مطلب کیا ہے تو وہ کہے گا کہ اے اللہ! ان دونوں جانوروں کو اس شخص پر جمع کردے۔

ابوالخطاب (عبدالحمید بن عبدالمجید المعروف بالاخفش الاکبر) کہتے ہیں کہ انہوں نے بعض عرب کو یہ کہتے سنا جب

اس سے کہا گیا: لِمَ اَفْسَدْتُمْ مَکَانکُمْ (هٰذَا)؟ :تم نے یہ جگہ خراب کیوں کردی؟ تو وہ جواباً صرف اتنا کہتا ہے: ''الصِّبْیَان'' (بچے) یعنی اس خیال سے کہ اُسے ملامت نہ کی جائے اس نے یہ کہنا چاہا تھا: ''لِم الصِّبْیان'' بچوں کو ملامت کرو (مجھے کیوں کرتے ہو)۔ اسی طرح ایک عرب سے پوچھا گیا: اَمَا (بمکان) کذا وکذَا وَجْذٌ؟ کیا فلاں جگہ پر تالاب ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے: بَلٰی وِجَاذًا ''کیوں نہیں! بہت سے تالاب'' یعنی ''اَعرفُ بِهَا وِجَاذًا'' (میں وہاں بہت سے تالاب جانتا ہوں) (وِجَاذ: وہ جگہ جو پانی کو روک کے رکھے)۔

بعض دفعہ پورا جملہ اسمیہ یا جملہ فعلیہ بھی حذف کر دیتے ہیں اگر کلام میں اس پر کوئی دلیل ہو (یعنی محذوف جملہ سمجھ میں آتا ہو)۔ مثلاً ارشاد فرمایا: ﴿وَالّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ﴾ (الطلاق:۴) ''اور وہ خواتین جو (حیض آنے سے) مایوس ہو چکی ہوں، تو اگر تم ان کی عدت کے بارے میں شک کرتے ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے''۔ اس کے بعد فرمایا: ﴿وَّالّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ ؕ﴾ ''اور وہ عورتیں جنہیں اب تک حیض نہیں آیا'' یعنی ان کی عدت بھی تین ماہ ہے (فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ)۔ اور مذکورہ یہ جملہ چونکہ سیاق وسباق سے واضح ہے، اس لیے محذوف ہے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔ یہاں بھی میرے خیال میں ''وَّثَامِنُهُمْ کَلْبُهُمْ'' ایک جملہ اسمیہ پر معطوف ہے جو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور وہ ہے: ''وَهُمْ کَذَالِکَ''، یعنی وہ کہتے ہیں کہ وہ سات ہیں، اور حقیقتاً ایسا ہی ہے، اور آٹھواں ان کا کتّا ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ''وَیَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ'' اور اس کے بعد ''وَّثَامِنُهُمْ کَلْبُهُمْ'' نکرہ کے وصف کے طور پر آیا ہے۔ زمخشریؒ کہتے ہیں کہ یہ وہ واؤ ہے جو نکرہ کے وصف کے طور پر آتا ہے، یا معرفہ کے بعد بطور جملہ حالیہ آتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی کہے: ''جاءنی زیدٌ ومعه آخر'' (میرے پاس زید آیا اور اس کے ساتھ دوسرا شخص بھی تھا) ''ومررتُ بزید وفی یده سیف'' (مَیں زید کے پاس گزرا اور اس کے ہاتھ میں تلوار تھی) ان دونوں مثالوں میں زید معرفہ ہے اور پھر ''واؤ'' کے بعد اس کی حالت بیان ہو رہی ہے۔ نکرہ کے بعد ''واؤ'' بطور وصف آتا ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے: ﴿وَمَآ اَهْلَکْنَا مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا وَلَهَا کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴﴾ (الحجر) ''اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے لیے معلوم مدت لکھ دی گئی تھی''۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس بات کی تاکید ہو جائے کہ صفت اپنے موصوف کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور دونوں کا باہم جڑے رہنا ایک دائمی امر ہے۔ سورۃ الکہف کی آیت میں اسے ایسے بیان کیا جائے گا کہ جن لوگوں نے کہا تھا کہ وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتّا ہے، وہ پوری دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ یہ بات کہہ رہے تھے اور دوسروں کی طرح وہ اٹکل پچو بات نہیں کر رہے تھے، اور اس بات کی دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دونوں اقوال کے بعد ﴿رَجْمًا ۢ بِالْغَیْبِ﴾ کہا اور تیسرے قول کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿مَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِیْلٌ ۣ﴾ ''اور اس بات کو نہیں جانتے مگر بہت تھوڑے لوگ۔''

ابن عباسؓ کہتے ہیں: جب ''واؤ'' آ گیا تو مزید گنتی کا راستہ بند ہو گیا، یعنی اب مزید کسی قول کی گنجائش

نہیں رہی۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ لوگ صرف سات ہی تھے اور آٹھواں ان کا کتّا تھا اور یہ کہ اس بات کو بہت کم لوگ (اہلِ کتاب میں سے) جانتے ہیں۔''سَيَقُوْلُوْنَ'' میں اس لحاظ سے ضمیر جمع اہلِ کتاب کی طرف جاتی ہے۔یعنی اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگ یہ کہیں گے'وہ کہیں گے'لیکن جنہیں ان کے عدد کا قطعی علم ہے ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے'زیادہ تر لوگ اندھیرے میں تیر چلانے والوں میں سے ہیں۔''(زمخشری کا کلام یہاں ختم ہوا)

جن قلیل لوگوں کو اس بات کا علم تھا' ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ مَیں ان قلیل لوگوں میں سے ایک ہوں۔ اتنا بیان کافی ہے۔واللہ اعلم!

[اضافہ از مترجم: ہم اس سے قبل تحریر کر چکے ہیں کہ کچھ اہل علم کے نزدیک اس واؤ کو 'واوالثامنہ'' بھی کہا جاتا ہے'یعنی جہاں سات صفات کا متصل ذکر ہو وہاں آٹھویں صفت کے ساتھ''واؤ''لایا جاتا ہے۔اس کی دلیل کے طور پر سورۃ الکہف کی یہ آیت' سورۃ التحریم کی آیت ۵' سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ اور سورۃ الزمر کی آیت ۷۱ (جس میں ابوابِ جہنّم جو کہ سات ہیں اس کے بعد بغیر واؤ کے''فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا'' کہا گیا اور آیت ۷۳ (جس میں ابوابِ جنت جو کہ آٹھ ہیں وہاں واؤ کے ساتھ''وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا'' کہا گیا' پیش کی جاتی ہیں۔ زمخشری اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے' اس لیے انہوں نے اس رائے کے رد میں وہ پوری تفصیل بیان کی ہے جو مندرجہ بالا سطور میں آچکی ہے۔واللہ اعلم!]

(۲۳۰) آیت ۳۶

﴿ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝۳۶ ﴾

''اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی گیا تو لوٹائے جانے کی جگہ اس سے بہتر چیز پاؤں گا۔''

اور سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ ﴾ (آیت ۵۰)

''اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی گیا تو اللہ کے پاس میرے لیے اچھا ہی اچھا ہوگا۔''

سوال یہ ہے کہ دونوں آیات کا مقصود ایک ہی ہے لیکن سورۃ الکہف میں لوٹائے جانے کے لیے''رُدِدْتُّ'' اور حٰمٓ السجدۃ میں''رُجِعْتُ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے' تو اس فرق کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے' واللہ اعلم' کہ اگرچہ دونوں آیات میں ایسے شخص کے کفر کا حال بیان ہو رہا ہے جو قیامت کے دن اٹھائے جانے کا انکار کرتا ہے' یعنی دونوں آیات میں اس کا قول نقل کیا گیا ہے: ﴿ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ﴾ ''اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی'' لیکن سورۃ الکہف میں جس شخص کی منظر کشی کی گئی ہے وہ حٰمٓ السجدۃ میں مذکور شخص کے مقابلے میں اپنے کفر اور انکار کے لحاظ سے زیادہ دور ہے۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت میں جس شخص کو مخاطب کیا گیا ہے وہ کافر بھی ہوسکتا ہے اور مؤمن بھی' کیونکہ اس کے بارے میں یہ وصف بیان ہوا ہے: ﴿ لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۫ ﴾ (آیت ۴۹) ''بھلائی کے مانگنے سے انسان تھکتا نہیں'' اور یہ وصف کافر اور مؤمن دونوں کا ہوسکتا ہے۔ ابن عطیہ نے اسی لیے پہلے تو یہ بیان کیا کہ یہ

آیت ولید بن مغیرہ یا عتبہ بن ربیعہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی‘ یعنی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت کا نزول کُفّار کے بارے میں ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ کہتے ہیں: ’’لیکن ملاحظہ ہو کہ ابتدا میں اس کی ایک ایسی خصلت بیان ہوئی ہے جو ایک مؤمن کی بھی ہو سکتی ہے‘ تو پھر یہ کہنا درست ہوگا کہ سورۃ حٰمٓ السجدۃ میں جس شخص کی مثال بیان ہو رہی ہے وہ سورۃ الکہف میں مذکور شخص کے مقابلے میں زیادہ پُرامید انسان دکھائی دیتا ہے۔‘‘

کیا یہ حقیقت نہیں کہ سورۃ الکہف کی شخصیت میں ایمان کا شائبہ دُور دُور تک نہیں دکھائی دیتا۔ مثال کی ابتدا ہی یوں ہو رہی ہے: ﴿وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ﴾ (آیت ۳۵) ’’اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اس حال میں کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا تھا۔‘‘ پھر اس کا یہ کہنا: ﴿مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ﴾ (آیات ۳۵۔۳۶) ’’اور میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی بھی تباہ ہو سکتا ہے‘ اور نہ یہ کہ قیامت کی گھڑی کبھی قائم ہوگی!‘‘ پھر قیامت کے دن اٹھائے جانے کی نفی کے باوجود اپنے اس یقین کو یوں بیان کرتا ہے کہ اگر مَیں اپنے ربّ کی طرف لوٹایا بھی گیا تو وہاں ان دونوں باغوں سے بہتر مجھے حاصل ہوگا۔ اب اس کا مقابلہ سورۃ حٰمٓ السجدۃ میں مذکور شخص سے کیجیے‘ اس کا یہ وصف بیان ہوا: ﴿لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۫﴾ (آیت ۴۹) یعنی یہ شخص خیر طلب کرتا ہے‘ زیادہ سے زیادہ خیر چاہتا رہتا ہے‘ اور یہ وصف تو ایک مؤمن کا ہے اور پھر وہ یہ بھی کہتا دکھائی دیتا ہے کہ ﴿وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ﴾ ’’اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی گیا تو بے شک اللہ کے پاس میرے لیے بہت کچھ اچھا ہوگا۔‘‘

سورۃ الکہف میں تو اسے یہ کہتا دکھائی دیا تھا کہ اگر مَیں اپنے ربّ کی طرف لوٹایا بھی گیا تو ان دو باغوں سے بہتر پاؤں گا‘ اور سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں اس کا قول مطلق اچھائی پانے کا ہے‘ یعنی اس کا قول زیادہ وسعت رکھتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ ’’رُدِدْتُّ‘‘ میں مقہور اور مغلوب ہو کر لوٹنے کا مفہوم غالب ہے لیکن اس کے مقابلے میں ’’رُجِعْتُ‘‘ (مادہ رَجَعَ) میں مقہوریت اور مغلوبیت کا یہ عنصر نہیں پایا جاتا۔ ’’رَدَّ‘‘ جہاں بھی آیا ہے وہاں مقہور و مغلوب ہونے کا مفہوم عیاں ہے‘ فرمایا: ﴿ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾﴾ (الکہف) ’’پھر وہ اپنے ربّ کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ اسے سخت عذاب دے گا۔‘‘ ﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (التوبۃ:۹۴) ’’اور پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ڈھکے چھپے اور ظاہر سب کو جانتا ہے۔‘‘ اور یہی بات اس آیت میں دہرائی گئی: ﴿وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (التوبۃ:۱۰۵) ’’اور تم عنقریب اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو غیب اور حاضر کو جانتا ہے۔‘‘ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بیان ہوا کہ انہوں نے ارشاد فرمایا:

> ’’گئی رات ایک سرکش جِنّ آیا اور میری نماز کو خراب کرنے لگا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت عطا کی تو مَیں نے اسے پچھاڑ دیا اور میں نے یہ ارادہ کیا کہ اُسے مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دوں تاکہ صبح ہو تو تم سب اسے دیکھ سکو‘ لیکن پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا یاد آئی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ﴾ (صٓ:۳۵) ’’اے رب! میری

مغفرت کر اور مجھے ایسی بادشاہت عطا کر جو میرے بعد کسی اور کو ملنے والی نہ ہو'' ((فَرَدَّهُ اللّٰهُ خَاسِئًا))
(صحیح مسلم) ''تو پھر اللہ نے اسے ذلیل وخوار کر کے لوٹا دیا۔''

یعنی لفظ ''رَدَّ'' اکثر اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں ''رَجَعَ'' بہت کم اس مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے اور اگر استعمال ہو بھی تو اس کثرت سے نہیں کہ جیسے ''رَدَّ'' استعمال ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن لوٹائے جانے کے لیے لفظ رَجَعَ بھی استعمال کیا ہے' جیسے:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ﴾ (البقرۃ:۲۸۱)

''اور اُس دن سے ڈرو کہ جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

تو یہ آیت مؤمن اور کافر دونوں کے لیے ہے' اور اگر اس سے مؤمن ہی مراد ہو تو پھر یہاں کسی ڈانٹ ڈپٹ جیسی صفت مراد نہیں ہو سکتی (کہ جو لفظ ''رَدَّ'' میں بتائی جاتی ہے)۔ واللہ اعلم!

(۲۳۱) آیت ۵۷

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا﴾

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے ربّ کی آیات یاد دلائی گئیں اور پھر اس نے ان سے منہ موڑا۔''

اور سورۃ السجدۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۭ﴾ (آیت ۲۲)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں جگہ ایک ہی آیت ہے لیکن پہلی آیت میں ''فَاَعْرَضَ'' فاء تعقیب کے ساتھ اور دوسری آیت میں بجائے فاء کے ''ثُمَّ'' لایا گیا ہے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے' واللہ اعلم' کہ سورۃ الکہف مکی سورت ہے اور اس میں شروع سے اس آیت تک خطاب اہلِ عرب تک محدود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سورت میں سوائے اصحابِ کہف کے قصے کے غیر عرب میں سے کسی کے حالات کا تذکرہ نہیں کیا گیا' اور اصحابِ کہف کا قصہ بھی یہود کی انگیخت پر قریش کے سوالات کے جواب میں بتایا گیا تھا۔

[جس کا تذکرہ ابن عباسؓ کی اس روایت میں ہے کہ سورۃ الکہف کا شانِ نزول یہ ہے کہ قریش نے النضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہود کے علماء کے پاس محمد ﷺ کی شخصیت اور ان کے اوصاف کے بارے میں جاننے کے لیے بھیجا تھا۔ علماء یہود نے یہ مشورہ دیا کہ ان سے یہ تین باتیں پوچھو اور اگر وہ ان کا جواب دے سکے تو وہ واقعی نبی مرسل ہیں: ان نوجوانوں کے بارے میں سوال کرو جو زمانۂ قدیم میں گھر چھوڑ کر نکل گئے تھے' اس آدمی کے بارے میں پوچھو جو زمین کے مشرق اور مغرب کا طواف کرتا چلا آیا تھا اور روح کے بارے میں پوچھو کہ اس کی ماہیت کیا ہے۔ چنانچہ قریشیوں نے نبی ﷺ سے یہ تینوں سوالات کیے تو آپؐ نے ایک دن کی مہلت مانگی۔ پندرہ دن تک کوئی وحی نہ آئی' اور پھر اہلِ مکّہ کی جلی کٹی باتیں آپؐ پر بہت گراں گزریں' تو جبرائیل علیہ السلام سورۃ الکہف لے کر نازل ہوئے جس میں عتاب بھی ہے اور ان کے سوالات کا جواب بھی ہے۔ ابن کثیر' اللباب اور قرطبی کی احکام القرآن میں یہ قصہ

مذکور ہے۔منقول از حاشیہ کتاب]

چنانچہ اس آیت میں جہاں ''اٰیٰتِ رَبِّہٖ'' کا ذکر ہے تو اس سے قرآن کی آیات اور قرآن کے واضح دلائل مراد ہیں۔ گو لفظ ''آیت'' تمام نشانیوں پر محیط ہے لیکن یہاں قرآن ہی کی آیات مراد ہیں اور اس بات کی تائید ان آیات سے ہوتی ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّا جَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً اَنۡ یَّفۡقَہُوۡہُ﴾ (الکہف:۵۷)

''ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں تاکہ وہ اسے نہ سمجھ پائیں۔''

﴿وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِلنَّاسِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ ؕ﴾ (الکہف: ۵۴)

''اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے طرح طرح کی مثالیں بیان کی ہیں۔''

سورۃ الاسراء میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَہُمُ الۡہُدٰۤی﴾ (آیت ۹۴)

''اور جب ہدایت آچکی تو لوگوں کو ایمان لانے سے کس چیز نے روکے رکھا۔''

یہاں ''الۡہُدٰی'' سے مراد القرآن ہے' جیسے سورۃ الجاثیۃ (آیت ۱۱) میں ارشاد فرمایا: ''ہٰذَا ہُدًی'' یہ ہدایت ہے۔

وہ چاہے پوری سورت سن لیں یا چند آیات' ان پر حجت قائم ہو جاتی ہے اور پھر جب وہ یہ بھی جان لیتے ہیں کہ وہ اس جیسا قرآن نہیں لا سکتے تو قرآن کی آیات سنتے ہی یہ حجت ان پر قائم ہو گئی اور اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے صرف ''فاء التعقیب'' لانا کافی تھا۔

[فاء التعقیب: دو جملوں کے درمیان اگر ''واؤ'' بطور عطف لایا جائے تو اس سے لازمی طور پر ترتیب مراد نہیں ہوتی' جیسے اگر یہ کہا: جَاءَ زیدٌ وخالدٌ وسعیدٌ'' تو ضروری نہیں کہ پہلے زید آیا ہو پھر خالد اور پھر سعید' لیکن اگر یہ کہا کہ جاء زید فخالدٌ فسعیدٌ تو فوری ترتیب مراد ہوتی ہے یعنی زید آیا اور پھر فوراً خالد اور پھر فوراً سعید۔ اگر بجائے ''فاء'' کے ''ثُمَّ'' کہہ دیا تو پھر فوری آمد مراد نہ ہوگی بلکہ زید کے آنے کے کچھ دیر بعد خالد آیا اور پھر کچھ دیر بعد سعید آیا۔ ''ثُمَّ'' چند خصائل میں رتبے کے لحاظ سے اہم ترین خصلت کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتا ہے جس کا بیان بعد میں آرہا ہے: اضافہ از مترجم]

جہاں تک سورۃ السجدۃ کی آیت کا تعلق ہے تو گو وہ بھی مکی سورت ہے لیکن وہ عرب' غیر عرب سب سے مخاطب ہے۔ یعنی جو شخص بھی آیات دیکھنے اور سننے کے بعد منہ پھیرے گا تو وہ ہی مذکورہ آیت کا مصداق ہوگا۔ اس عمومیت کی دلیل اسی سورت کی یہ آیت ہے:

﴿اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا کَمَنۡ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ ﴿۱۸﴾﴾

''کیا ایک شخص جو مومن ہو وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جو فاسق ہو؟ (نہیں!) وہ برابر نہیں ہو سکتے۔''

یہاں ہر اُس شخص کا بیان ہو رہا ہے جو مکلف قرار دیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد مذکورہ آیت آتی ہے جس میں اس بات پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دیکھتا ہو اور پھر

بجائے ایمان لانے کے منہ پھیر لیتا ہو۔ یہاں آیات سے مراد ہر طرح کی نشانیاں ہیں کہ جو حق کو واضح کرنے کے لیے دکھائی گئی تھیں۔ جیسے صالح علیہ السلام کی اونٹنی جو چٹان کے اندر سے ظاہر ہوئی تھی یا موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کہ جن میں ان کا عصا ایک سانپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے یا عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات جیسے مادر زاد اندھے کو بینائی عطا کرنا' کوڑھی کو شفا دینا' مردے کو زندہ کرنا شامل ہیں۔ یا وہ نشانیاں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی تھیں' جیسے چاند کا دو ٹکڑے کیا جانا' آپؐ کی انگلیوں سے پانی کا بہنا' جمادات کا بول اٹھنا' حیوانات کا بات کرنا' کسی چیز کی ماہیت کا تبدیل ہو جانا' ذرا سے کھانے کا بہت زیادہ ہو جانا ----- اور سب سے بڑھ کر قرآن حکیم کی آیات کا عطا کیا جانا جو آج تک پڑھا جاتا ہے' اور ایسے ہی بہت ساری دوسری نشانیاں جو نبیوں اور رسولوں کو عطا کی گئی تھیں۔ جب ''بِاٰیٰتِ رَبِّہٖ'' میں یہ سب نشانیاں بشمول آیاتِ قرآن آ جاتی ہیں جو کہ ایک عقل سلیم رکھنے والے شخص کی ہدایت کے لیے کافی ہیں' لیکن پھر بھی کوئی بدبخت انہیں دیکھنے اور سننے کے بعد ایمان نہ لائے تو اس پر تعجب کا اظہار کیوں نہ کیا جائے۔ یہاں لفظ ''ثُمَّ'' انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ کوئی شخص اتنی ڈھیر ساری نشانیاں دیکھنے کے باوجود ان سے منہ پھیر لیتا ہے تو یہ تو بہت ہی اچنبھے کی بات ہوگی۔

یہاں اس مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ہم زمخشری کا حوالہ دیں گے' وہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا'' استبعاد کے لیے ہے' یعنی یہ بات عقل سے بہت دُور ہے کہ ایک انسان کو ایسی ایسی نشانیاں دکھائی جائیں جو واضح ہوں' روزِ روشن کی طرح صاف اور عیاں ہوں' سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہوں' اور سب سے بڑی کامیابی کی نوید لاتی ہوں' اور پھر بھی یہ انسان ایمان نہ لائے بلکہ منہ پھیر لے؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی اپنے دوست سے کہے: ''وجدتَ مِثْلَ تِلْکَ الْفُرصَة ثُمَّ لَمْ تَنْتَهِزْهَا'' ''عجب ہے کہ تمہیں ایک موقع ملا تھا پھر بھی تم نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا!'' حماسہ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

لَا یَکْشِفُ الْغَمَّاءَ اِلَّا ابْنُ حُرَّةٍ   یَرٰی غَمَرَاتِ الْمَوْتِ ثُمَّ یَزُوْرُهَا

''پوشیدہ (تکالیف اور مشکلات) کو سرِ عام وہی شخص ختم کر سکتا ہے جو ایک آزاد عورت کا بیٹا ہو' وہ موت کی سختیوں کو دیکھتا ہے اور پھر بھی اس میں جا کودتا ہے۔''

مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص بڑا بہادر ہے' موت کی سختیوں کو دیکھ رہا ہے لیکن بجائے اس کے کہ وہ ان سے صرفِ نظر کرے' وہ انہیں خود آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔

زمخشری کا کلام یہاں ختم ہوا۔ آخر کا فقرہ میں نے حذف کر دیا ہے کہ وہ اس کے خبیث مسلک کی نمائندگی کرتا ہے' اور اس کے حذف کرنے سے اصل مقصود میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ہے۔''(1)

گویا ''ثُمَّ'' کے اندر جو تراخی (دیر سے آنے) کا مفہوم پایا جاتا ہے وہ یہاں بمعنی استبعاد ہے' کہ ایک آدمی حق بات کی ساری نشانیاں دیکھ چکا ہے' اور اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ایمان لے آئے لیکن اس نے منہ پھیر کر وہ کام کیا جو عقل سے بہت بعید ہے۔

[اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک شخص اپنے دوست سے یہ کہے: رأَيْتَ عَدُوَّكَ مُنْفرِدًا نَائِمًا ثُمَّ لَمْ تَقْتُلْهُ ''تم نے اپنے دشمن کو تنہا دیکھا اور وہ سو بھی رہا تھا پھر بھی تم نے اسے قتل نہ کیا!''یعنی اسے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قتل کر دینا چاہیے تھا' اور یہ بات عقل میں آتی ہے' لیکن ''نہ قتل کرنا'' ایسی بات ہے جو عقل میں نہیں آتی! اضافہ از مترجم]

یہاں ایک دوسرا جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ سورۃ الکہف میں مذکورہ آیت سے قبل ارشاد فرمایا تھا:

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ﴾ (آیت ۵۶)

''اور ہم نے رسول نہیں بھیجے مگر خوشخبری دینے کے لیے اور ڈرانے کے لیے' اور کُفّار ناحق حجت بازی کرتے ہیں تاکہ حق کو مٹا سکیں۔''

اور پھر مذکورہ آیت آتی ہے جس میں ''فَاَعْرَضَ عَنْهَا'' کہا گیا ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ فاءِ تعقیب ایک کام کے فوراً بعد دوسرے کام کے کیے جانے پر لائی جاتی ہے۔ یعنی جب رسولوں نے انہیں ایمان لانے کی دعوت دی تو ان کُفّار نے حجت بازی شروع کر دی اور پھر اس کے نتیجے میں انہوں نے منہ پھیرا۔ تو یہاں فاءِ التعقیب لانا بالکل مناسب تھا۔

جہاں تک سورۃ السجدۃ کی آیت کا تعلق ہے تو یہاں نہ رسولوں کے بھیجے جانے کا ذکر ہے' نہ رسولوں کی طرف سے ان کے بلانے کا اور پھر ان کے جھٹلانے کا تذکرہ ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہ آیات عرب' غیر عرب سب کے بارے میں ہیں' اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ لوگ اپنے اعمال کے اعتبار سے جانے جاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ ۞ ﴾ (آیت ۱۸)

''تو کیا وہ جو مؤمن ہے اس جیسا ہو سکتا ہے جو کہ فاسق ہے؟ وہ برابر نہیں!''

اس کے بعد دونوں فریقین کی جزا کا ذکر کیا اور بتایا کہ فاسقوں کا ٹھکانا ایک آگ ہوگی اور یہ عالم ہوگا کہ:

﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ﴾ (آیت ۲۰)

''جب بھی وہ اس آگ سے نکلنا چاہیں گے' دوبارہ اس میں لوٹا دیے جائیں گے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں یہ سزا اس لیے ملی ہے کہ وہ مرنے تک اسی کفر پر ڈٹے رہے' لیکن یہاں کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ رسولوں کو جھٹلایا کرتے تھے' اور جب کہ اس سارے کلام میں نہ رسولوں کا ذکر ہے اور نہ ان کو جھٹلائے جانے کا' تو معلوم ہوا کہ ان کا انجام ان کی جزا و سزا کے ذکر سے ہوا۔ اہلِ ایمان کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ انہیں تو اس بات کا علم وحی الٰہی کے ذریعہ ہو گیا تھا لیکن کفر کرنے والوں کو تو اس کا علم تبھی ہوگا جب وہ اس جزا و سزا کو خود دیکھ لیں گے۔ اب چونکہ جزا و سزا تو تاخیر سے آئے گی اس لیے مناسب تھا کہ یہاں لفظ ''ثُمَّ'' لایا جائے کہ جو تراخی (یعنی دیر سے) لانے کا مفہوم رکھتا ہے' اور اس لیے کہا گیا: ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ﴾ اور یوں دونوں آیات اپنی اپنی جگہ پر گہری مناسبت رکھتی ہیں۔ واللہ اعلم!

(باقی صفحہ 50 پر)

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سُورۃُ اِبراھِیم

آیات ۱ تا ۴

﴿الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى
صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ
مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِۨ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا
بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۝﴾

ترکیب

(آیت ۱) كِتٰبٌ خبر ہے اور اس کا مبتدا محذوف ہے۔ (آیت ۲) اَلْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ کا بدل ہونے کی وجہ سے اللّٰهِ حالتِ جر میں آیا ہے۔ (آیت ۳) يَبْغُوْنَهَا کی ضمیر مفعول سَبِيْلِ کے لیے ہے۔

ترجمہ:

الٓرٰ: اَل،ر	كِتٰبٌ: (یہ) ایک کتاب ہے
اَنْزَلْنٰهُ: ہم نے اُتارا اس کو	اِلَيْكَ: آپؐ کی طرف
لِتُخْرِجَ: تاکہ آپؐ نکالیں	النَّاسَ: لوگوں کو
مِنَ الظُّلُمٰتِ: اندھیروں سے	اِلَى النُّوْرِ: روشنی کی طرف
بِاِذْنِ رَبِّهِمْ: اپنے ربّ کی اجازت سے	اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ: حمد کیے ہوئے بالادست کے راستے کی طرف

اللّٰهِ الَّذِیۡ : جو وہ اللہ ہے	لَهٗ مَا : جس کے لیے ہی ہے وہ جو
فِی السَّمٰوٰتِ : آسمانوں میں ہے	وَمَا فِی الۡاَرۡضِ : اور وہ جو زمین میں ہے
وَوَیۡلٌ : اور ہلاکت ہے	لِّلۡکٰفِرِیۡنَ : کافروں کے لیے
مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِ : ایک شدید عذاب سے	اَلَّذِیۡنَ : وہ لوگ جو
یَسۡتَحِبُّوۡنَ : ترجیح دیتے ہیں	الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا : دُنیوی زندگی کو
عَلَی الۡاٰخِرَةِ : آخرت پر	وَیَصُدُّوۡنَ : اور وہ روکتے ہیں
عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ سے	وَیَبۡغُوۡنَهَا : اور تلاش کرتے ہیں اس میں
عِوَجًا : کجی کو	اُولٰٓئِكَ : یہ لوگ
فِیۡ ضَلٰلٍۢ بَعِیۡدٍ : دور والی گمراہی میں ہیں	وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا : اور ہم نے نہیں بھیجا
مِنۡ رَّسُوۡلٍ : کوئی بھی رسول	اِلَّا : مگر
بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ : اپنی قوم کی زبان (بولنے) والا	لِیُبَیِّنَ : تاکہ وہ خوب واضح کر دے
لَهُمۡ : ان کے لیے	فَیُضِلُّ اللّٰهُ : پھر گمراہ کرتا ہے اللہ
مَنۡ یَّشَآءُ : اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	وَیَهۡدِیۡ : اور وہ ہدایت دیتا ہے
مَنۡ یَّشَآءُ : اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	وَهُوَ : اور وہ ہی
الۡعَزِیۡزُ : بالادست ہے	الۡحَکِیۡمُ : حکمت والا ہے

نوٹ ۱ : ظُلُمٰت سے مراد عقائد اور اعمال کی تاریکیاں اور نور سے مراد ایمان اور عمل صالح کی روشنی ہے۔ گمراہی کے ہزاروں راستے ہیں لیکن ہدایت کی راہ ایک ہی ہے۔ اس وجہ سے ظُلُمٰت جمع ہے اور نُوۡر واحد۔ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ کا مطلب یہ ہے کہ تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف آنا جن کو بھی میسّر ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے ہی میسّر ہوگا۔ وہی اپنی سُنّت کے مطابق جن کو ہدایت کا اہل پائے گا ان کو ہدایت بخشے گا اور جن کو اس کا اہل نہیں پائے گا ان کو گمراہی میں بھٹکتا چھوڑ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی ذمہ داری اس معاملے میں دعوت و تبلیغ کی ہے۔ لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لا کھڑا کرنا اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ (تدبّرِ قرآن)

نوٹ ۲ : رسول اللہ ﷺ کی بعثت پوری اقوام دنیا کے لیے ہے۔ ایسی صورت میں یہ بھی ہوسکتا تھا کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتا، لیکن اس کو تو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی بھی درست نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ قرآن کسی ایک ہی زبان میں آئے، پھر دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے پھیلائے جائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کی زبانوں میں سے عربی کا انتخاب فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی آسمان کی زبان ہے۔ فرشتوں کی زبان عربی ہے، لوحِ محفوظ کی زبان عربی ہے اور جنت کی زبان بھی عربی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو۔ ایک یہ کہ مَیں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے اور تیسرے یہ کہ

اہل جنت کی زبان عربی ہے۔ تفسیر قرطبی وغیرہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی۔ زمین پر نازل ہونے کے بعد عربی ہی میں تغیرات ہو کر سریانی زبان پیدا ہوئی۔ اس سے ان روایات کی بھی تائید ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں ان کی اصلی زبان عربی ہی تھی۔ جبرائیل امین علیہ السلام نے قومی زبانوں میں ترجمہ کر کے پیغمبروں کو بتلایا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فطری طور پر عربی زبان سے ایک مناسبت عطا فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس ملک میں بھی پہنچے' تھوڑے ہی عرصہ بعد بغیر جبر و اکراہ کے پورے ملک کی زبان عربی ہو گئی۔ آج جو عربی ممالک کہلاتے ہیں' جیسے عراق' شام' مصر وغیرہ' ان میں سے کسی کی زبان بھی عربی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت میں تعلیم و تعلّم' تصنیف و تالیف اور تبلیغ و اشاعت کا ایسا جذبہ پیدا فرما دیا کہ اس کی نظیر پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کے نتیجہ میں عجمی اقوام میں نہ صرف قرآن و سنت کے علوم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا بلکہ عربی زبان کو حاصل کرنے اور اس کی ترویج و اشاعت میں عجمیوں کا قدم عرب سے پیچھے نہیں رہا۔ یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اس وقت عربی لغت اور اس کی گرامر پر جتنی کتابیں دنیا میں موجود ہیں وہ بیشتر عجمیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ قرآن و سنت کی جمع و تدوین اور تفسیر میں بھی ان کا حصہ عربوں سے کم نہیں رہا۔

اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اور آپؐ کی کتاب عربی ہونے کے باوجود پورے عالم پر محیط ہو گئی اور دعوت و تبلیغ کی حد تک عرب و عجم کا فرق مٹ گیا اور رسول کو قوم کی زبان میں بھیجنے کی جو حکمت تھی وہ حاصل ہو گئی۔ (''معارف القرآن'' سے ماخوذ)

آیات ۵ تا ۸

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۵ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۶ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۷ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۸﴾

ترجمہ:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا : اور ہم بھیج چکے ہیں
مُوْسٰی : موسیٰؑ کو
بِاٰیٰتِنَآ : اپنی نشانیوں کے ساتھ
اَنْ اَخْرِجْ : کہ آپؑ نکالیں
قَوْمَكَ : اپنی قوم کو
مِنَ الظُّلُمٰتِ : اندھیروں سے

اِلَی النُّوۡرِ : روشنی کی طرف

بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ : اللہ کے دنوں کے ساتھ

لَاٰیٰتٍ : یقیناً نشانیاں ہیں

شَکُوۡرٍ : بہت شکر گزار کے لیے

مُوۡسٰی : موسیٰؑ نے

اذۡکُرُوۡا : تم لوگ یاد کرو

عَلَیۡکُمۡ : تم لوگوں پر

مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ : فرعون کے پیروکاروں سے

سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ : عذاب کی برائی سے

اَبۡنَآءَکُمۡ : تمہارے بیٹوں کو

نِسَآءَکُمۡ : تمہاری عورتوں کو

بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ : تمہارے ربّ کی طرف سے ایک بڑی آزمائش تھی

رَبُّکُمۡ : تمہارے ربّ نے

شَکَرۡتُمۡ : تم لوگ شکر کرو گے

وَلَئِنۡ : اور البتہ اگر

اِنَّ عَذَابِیۡ : تو بے شک میرا عذاب

وَقَالَ مُوۡسٰی : اور کہا موسیٰؑ نے

اَنۡتُمۡ : تم لوگ

فِی الۡاَرۡضِ : زمین میں ہیں

فَاِنَّ اللّٰهَ : تو بے شک اللہ

حَمِیۡدٌ : حمد کیا ہوا ہے

وَذَکِّرۡهُمۡ : اور آپؐ نصیحت کریں ان کو

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ : بے شک اس میں

لِّکُلِّ صَبَّارٍ : ہر ایک بہت ثابت قدم کے لیے

وَاِذۡ قَالَ : اور جب کہا

لِقَوۡمِهٖ : اپنی قوم سے

نِعۡمَةَ اللّٰهِ : اللہ کی نعمت کو

اِذۡ اَنۡجٰکُمۡ : جب اس نے نجات دی تم کو

یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ : وہ لوگ تکلیف دیتے تھے تم کو

وَیُذَبِّحُوۡنَ : اور وہ ذبح کیا کرتے تھے

وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ : اور زندہ رکھتے تھے

وَفِیۡ ذٰلِکُمۡ : اور اس میں

وَاِذۡ تَاَذَّنَ : اور جب جتا دیا

لَئِنۡ : یقیناً اگر

لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ : تو میں لازماً زیادہ کروں گا تم کو (ہر لحاظ سے)

کَفَرۡتُمۡ : تم لوگ ناشکری کرو گے

لَشَدِیۡدٌ : یقیناً شدید ہے

اِنۡ تَکۡفُرُوۡۤا : اگر تم ناشکری کرو گے

وَمَنۡ : اور وہ (بھی) جو

جَمِیۡعًا : سب کے سب

لَغَنِیٌّ : یقیناً بے نیاز ہے

نوٹ: مسند احمد کی مرفوع حدیث میں اَیَّامِ اللّٰہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مروی ہے (ابن کثیر)۔ اَیَّام کا لفظ جب اس طرح آتا ہے جیسے یہاں آیا ہے تو اس سے اہم تاریخی دن مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً ''اَیَّام العرب'' سے عرب کی جنگیں مراد ہوں گی۔ اسی طرح ''اَیّٰىمِ اللّٰهِ'' سے مراد وہ تاریخی دن ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نافرمان قوموں پر عذاب نازل فرمائے اور اہلِ ایمان کو ان کے ظلم وستم سے نجات دی۔ (تدبّرِ قرآن)

آیات ۹ تا ۱۲

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْ ۢ بَعْدِهِمْ ۛ
لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا
اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۹﴾ قَالَتْ رُسُلُهُمْ
اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ
وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا
عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ
هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾

ترکیب

(آیت ۹) نَبَؤُا مضاف ہے۔ اس کے آگے الف کا اضافہ قرآن کا املا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اس کا مضاف الیہ ہے اور محلًّا حالت جر میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ کا بدل ہونے کی وجہ سے قَوْمِ حالتِ جر میں آیا ہے جبکہ قَوْمِ کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے نُوْحٍ مجرور ہے۔ عَادٍ اور ثَمُوْدَ بھی اَلَّذِيْنَ کا بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہیں۔ مُرِيْبٍ کو شَكٍّ کی صفت بھی مانا جاسکتا ہے لیکن ہماری ترجیح ہے کہ اس کو شَكٍّ کا بدل مانا جائے۔

ترجمہ:

اَلَمْ يَاْتِكُمْ : کیا نہیں پہنچی تم لوگوں کو
نَبَؤُا الَّذِيْنَ : ان لوگوں کی خبر جو

مِنْ قَبْلِكُمْ : تم سے پہلے تھے
قَوْمِ نُوْحٍ : (جیسے) قومِ نوحؑ

وَّعَادٍ : اور عاد
وَّثَمُوْدَ : اور ثمود

وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو
مِنْ ۢ بَعْدِهِمْ : ان کے بعد ہوئے

لَا يَعْلَمُهُمْ : نہیں جانتا ان کو (کوئی)
اِلَّا اللّٰهُ : مگر اللہ

جَآءَتْهُمْ : آئے ان کے پاس
رُسُلُهُمْ : ان کے رسول

بِالْبَيِّنٰتِ : واضح (نشانیوں) کے ساتھ
فَرَدُّوْٓا : تو انہوں نے لوٹائے

اَيْدِيَهُمْ : اپنے ہاتھ
فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ : اپنے مونہوں میں

وَقَالُوْٓا : اور کہا
اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ : بے شک ہم نے انکار کیا اس کا

اُرْسِلْتُمْ بِهٖ : آپؑ لوگ بھیجے گئے جس کے ساتھ
وَاِنَّا : اور بے شک ہم

لَفِیۡ شَکٍّ : یقیناً ایک شک میں ہیں

تَدۡعُوۡنَنَاۤ : آپؑ بلاتے ہیں ہم کو

مُرِیۡبٍ : جو شبہ میں ڈالنے والا ہے

اَفِی اللّٰہِ : کیا اللہ (کے بارے) میں

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ : جو آسمانوں اور زمین کو وجود بخشنے والا ہے

لِیَغۡفِرَ : تاکہ وہ بخش دے

مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ : تمہارے گناہوں میں سے (کچھ) کو

اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی : ایک مقررہ مدت تک

اِنۡ اَنۡتُمۡ : آپؑ لوگ نہیں ہیں

مِّثۡلُنَا : ہمارے جیسے

اَنۡ تَصُدُّوۡنَا : کہ روک دیں ہم کو

کَانَ یَعۡبُدُ : بندگی کرتے تھے

فَاۡتُوۡنَا : تو لائیں ہمارے پاس

قَالَتۡ لَہُمۡ : کہا ان سے

اِنۡ نَّحۡنُ : ہم نہیں ہیں

مِّثۡلُکُمۡ : تمہارے جیسے

یَمُنُّ : احسان کرتا ہے

یَّشَآءُ : وہ چاہتا ہے

وَمَا کَانَ : اور (ممکن) نہیں ہے

اَنۡ نَّاۡتِیَکُمۡ : کہ ہم لائیں تمہارے پاس

اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ : مگر اللہ کی اجازت سے

فَلۡیَتَوَکَّلِ : چاہیے کہ بھروسا کریں

وَمَا لَنَاۤ : اور ہمیں کیا ہے

عَلَی اللّٰہِ : اللہ پر

مِّمَّا : اس سے

اِلَیۡہِ : جس کی طرف

قَالَتۡ رُسُلُہُمۡ : کہا ان کے رسولوں نے

شَکٌّ : شک ہے

یَدۡعُوۡکُمۡ : وہ بلاتا ہے تم لوگوں کو

لَکُمۡ : تمہارے لیے

وَیُؤَخِّرَکُمۡ : اور تاکہ وہ پیچھے کرے (یعنی مہلت دے) تم لوگوں کو

قَالُوۡۤا : ان لوگوں نے کہا

اِلَّا بَشَرٌ : مگر ایک بشر

تُرِیۡدُوۡنَ : آپؑ لوگ چاہتے ہیں

عَمَّا : اس سے جس کی

اٰبَآؤُنَا : ہمارے آباء واجداد

بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ : کوئی واضح دلیل

رُسُلُہُمۡ : ان کے رسولوں نے

اِلَّا بَشَرٌ : مگر ایک بشر

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ : اور لیکن اللہ

عَلٰی مَنۡ : اس پر جس پر

مِنۡ عِبَادِہٖ : اپنے بندوں میں سے

لَنَاۤ : ہمارے لیے

بِسُلۡطٰنٍ : کوئی دلیل

وَعَلَی اللّٰہِ : اور اللہ پر ہی

الۡمُؤۡمِنُوۡنَ : ایمان لانے والے

اَلَّا نَتَوَکَّلَ : کہ ہم بھروسا نہ کریں

وَقَدۡ ہَدٰىنَا : اس حال میں کہ اس نے ہدایت دی ہے ہم کو

سُبُلَنَا : ہماری راہوں کی — وَلَنَصۡبِرَنَّ : اور ہم لازماً ثابت قدم رہیں گے

عَلٰی مَآ : اس پر جو — اٰذَیۡتُمُوۡنَا : تم لوگ اذیت دیتے ہو ہم کو

وَعَلَی اللّٰہِ : اور اللہ پر ہی — فَلۡیَتَوَکَّلِ : چاہیے کہ بھروسا کریں

الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ : بھروسا کرنے والے

نوٹ: مذکورہ آیات میں رسولوں اور ان کی قوموں کے لیے جمع کے صیغے آئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سب قومیں اور ان کے رسول ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ موجود تھے جب یہ مکالمہ ہوا تھا۔ بلکہ ہر قوم کے مقام پر اور اس کے وقت پر اس کے پاس ان کا رسول آیا تھا۔ ان قوموں کے مابین زمان و مکان کا بہت فاصلہ ہے' اس کے باوجود ہر زمانے میں اللہ کے رسولوں کا پیغام ایک ہی رہا ہے اور ان کو جواب بھی ایک ہی ملا ہے۔ اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ مکالمہ جمع کے صیغے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نبوت و رسالت کا انکار کرنے والوں کی ایک دلیل ہمیشہ متحرک رہی ہے اور وہ یہ کہ کوئی بشر نبی نہیں ہوسکتا۔ اور چونکہ نبوت و رسالت کے مدعی بشر ہوتے تھے اس لیے ان کی قومیں ان کا انکار کرتی تھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر زمانے میں ہر نبی اور رسول نے اس دلیل کے جواب میں ہمیشہ اپنی بشریت کا اعتراف اور اقرار کیا۔ کسی ایک بھی نبی یا رسول نے کبھی مافوق البشر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں ہی سے کسی کو اس منصب پر فائز کرتا ہے۔ (حافظ احمد یار صاحب کے کیسٹ سے ماخوذ)

آیات ۱۳ تا ۱۸

﴿وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِرُسُلِہِمۡ لَنُخۡرِجَنَّکُمۡ مِّنۡ اَرۡضِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِیۡ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوۡحٰۤی
اِلَیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ لَنُہۡلِکَنَّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسۡکِنَنَّکُمُ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ
خَافَ مَقَامِیۡ وَخَافَ وَعِیۡدِ ﴿۱۴﴾ وَاسۡتَفۡتَحُوۡا وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنۡ وَّرَآئِہٖ
جَہَنَّمُ وَیُسۡقٰی مِنۡ مَّآءٍ صَدِیۡدٍ ﴿۱۶﴾ یَّتَجَرَّعُہٗ وَلَا یَکَادُ یُسِیۡغُہٗ وَیَاۡتِیۡہِ الۡمَوۡتُ مِنۡ کُلِّ
مَکَانٍ وَّمَا ہُوَ بِمَیِّتٍ ؕ وَمِنۡ وَّرَآئِہٖ عَذَابٌ غَلِیۡظٌ ﴿۱۷﴾ مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ
اَعۡمَالُہُمۡ کَرَمَادِ ۣاشۡتَدَّتۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ یَوۡمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقۡدِرُوۡنَ مِمَّا کَسَبُوۡا عَلٰی شَیۡءٍ ؕ
ذٰلِکَ ہُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِیۡدُ ﴿۱۸﴾﴾

ج ر ع

جَرَعَ یَجۡرَعُ (ف) جَرۡعًا : پانی یک بارگی پی جانا۔

تَجَرَّعَ (تفعل) تَجَرُّعًا : بتکلف گھونٹ گھونٹ پینا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۷۔

س و غ

سَاغَ یَسُوۡغُ (ن) سَوۡغًا : آسانی سے گلے سے اترنا' خوش گوار ہونا۔

سَائِغٌ (فَاعِلٌ کے وزن پر صفت) : خوش گوار ہونے والا یعنی خوش گوار۔ ﴿لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿٦٦﴾﴾ (النحل) ’’خالص دودھ‘ خوش گوار ہوتے ہوئے پینے والوں کے لیے۔‘‘

اَسَاغَ (افعال) اِسَاغَةً : آسانی سے گلے سے اتارنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۷۔

ر م د

رَمَدَ يَرْمِدُ (ض) رَمْدًا : آگ کا بجھ کر ٹھنڈا ہو جانا‘ راکھ ہو جانا۔

رَمَادٌ (اسم ذات) : راکھ۔ زیر مطالعہ آیت ۱۸۔

ترجمہ:

وَقَالَ : اور کہا	الَّذِيْنَ : ان لوگوں نے جنہوں نے
كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ : انکار کیا اپنے رسولوں سے	لَنُخْرِجَنَّكُمْ : کہ ہم لازماً نکالیں گے آپؐ لوگوں کو
مِّنْ اَرْضِنَآ : اپنی زمین سے	اَوْ لَتَعُوْدُنَّ : یا (پھر) آپؐ لوگ لازماً لوٹیں گے
فِيْ مِلَّتِنَا : ہمارے مذہب میں	فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ : تو وحی کیا ان کی طرف
رَبُّهُمْ : انؐ کے ربّ نے	لَنُهْلِكَنَّ : ہم لازماً ہلاک کریں گے
الظّٰلِمِيْنَ : ظلم کرنے والوں کو	وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ : اور ہم لازماً سکونت دیں گے آپؐ لوگوں کو
الْاَرْضَ : اس زمین میں	مِنْۢ بَعْدِهِمْ : ان کے بعد
ذٰلِكَ لِمَنْ : یہ اس کے لیے ہے جو	خَافَ : ڈرا
مَقَامِيْ : میرے سامنے کھڑا ہونے سے	وَخَافَ : اور ڈرا
وَعِيْدِ : میری وارننگ سے	وَاسْتَفْتَحُوْا : اور انہوں نے فیصلہ مانگا
وَخَابَ : اور نامراد ہوا	كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ : ہر ایک زبردست‘ ہٹ دھرم
مِّنْ وَّرَآئِهٖ : اس کے پیچھے	جَهَنَّمُ : دوزخ ہے
وَيُسْقٰى : اور اس کو پلایا جائے گا	مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ : پیپ والے پانی میں سے
يَّتَجَرَّعُهٗ : وہ مشکل سے گھونٹ گھونٹ پیے گا اس کو	وَلَا يَكَادُ : اور لگے گا نہیں کہ
يُسِيْغُهٗ : وہ گلے سے اتارے گا اس کو	وَيَاْتِيْهِ : اور آئے گی اس کے پاس
الْمَوْتُ : موت	مِنْ كُلِّ مَكَانٍ : ہر جگہ سے
وَّمَا هُوَ : اس حال میں کہ وہ نہیں ہوگا	بِمَيِّتٍ : مردہ

وَمِنْ وَّرَآئِهٖ : اور اس کے پیچھے	عَذَابٌ غَلِيْظٌ : ایک غلیظ عذاب ہے
مَثَلُ الَّذِيْنَ : ان کی مثال جنہوں نے	كَفَرُوْا : کفر کیا
بِرَبِّهِمْ : اپنے رب کا (یہ ہے کہ)	اَعْمَالُهُمْ : ان کے اعمال
كَرَمَادِ ِۨ : راکھ کی مانند ہیں	اشْتَدَّتْ : شدت اختیار کی
بِهِ الرِّيْحُ : جن پر ہوا نے	فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ : ایک تیز آندھی والے دن میں
لَا يَقْدِرُوْنَ : وہ قدرت نہیں رکھیں گے	مِمَّا كَسَبُوْا : اس میں سے جو انہوں نے کمایا
عَلٰى شَيْءٍ : کسی چیز پر	ذٰلِكَ : یہ
هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ : ہی دور والی گمراہی ہے	

آیات ۱۹ تا ۲۳

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ
جَدِيْدٍ ۝ۙ۱۹ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝۲۰ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ
اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا
لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝۲۱ وَقَالَ
الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا
كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ
قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۲۲ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۝۲۳﴾

ج ز ع

جَزِعَ يَجْزَعُ (س) جَزَعًا : بے صبری کرنا، رنج وغم کا اظہار کرنا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۱۔

جَزُوْعٌ (فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ) : رنج وغم کا بہت زیادہ اظہار کرنا، واویلا کرنا۔ ﴿اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝۲۰﴾ (المعارج) ''جب چھوا اُس کو (یعنی انسان کو) برائی نے تو واویلا کرنے والا ہے۔''

ص ر خ

صَرَخَ يَصْرُخُ (ن) صُرَاخًا : (۱) چیخنا چلانا، فریاد کرنا۔ (۲) کسی کی فریاد کو پہنچنا، مدد کرنا۔

صَرِيْخٌ : فریاد کو پہنچنے والا۔ ﴿وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ﴾ (یٰس: ۴۳) ''اور اگر ہم چاہیں تو

ہم غرق کر دیں ان کو پھر کوئی بھی فریاد کو پہنچنے والا نہیں ہے ان کے لیے۔‘‘

اَصْرَخَ (افعال) اِصْرَاخًا : کسی کی فریاد کو پہنچنا‘ مدد کرنا۔

مُصْرِخٌ : فریاد کو پہنچنے والا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۲۔

اِصْتَرَخَ (افتعال) اِصْتِرَاخًا اور اِصْطِرَاخًا : مدد کے لیے زور سے چلّانا۔ ﴿وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا﴾ (فاطر:۳۷) ’’اور وہ لوگ چلّائیں گے اس میں کہ اے ہمارے رب تُو نکال ہم کو۔‘‘

ترکیب

(آیت ۲۱) تَبَعًا مصدر ہے۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ تَابِعٌ کی جمع بھی تَبَعًا آتی ہے۔ اس آیت میں اس کو تَابِعٌ کی جمع ماننا زیادہ بہتر ہے۔ اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا‘ یہ جملہ کی وہی ترکیب ہے جو ہم البقرۃ:۶ میں پڑھ آئے ہیں: ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ ۔فرق یہ ہے کہ یہاں اَمْ کے بعد فعل مضارع پر لَمْ داخل کرنے کے بجائے فعل ماضی صَبَرْنَا آیا ہے۔ لیکن ’’اَ‘‘ اور ’’اَمْ‘‘ کے معنی وہی رہیں گے۔ (آیت ۲۲) بِمُصْرِخِيَّ دراصل بِمُصْرِخِيْنَ تھا۔ مضاف ہونے کی وجہ سے نون اعرابی گرا تو بِمُصْرِخِيْ باقی بچا۔ پھر اس پر یائے متکلم داخل ہوئی تو بِمُصْرِخِيَّ ہو گیا۔

ترجمہ:

اَلَمْ تَرَ : کیا تو نے غور نہیں کیا
اَنَّ اللّٰهَ : کہ اللہ نے

خَلَقَ : پیدا کیا
السَّمٰوٰتِ : آسمانوں کو

وَالْاَرْضَ : اور زمین کو
بِالْحَقِّ : حق (یعنی مقصد) کے ساتھ

اِنْ يَّشَاْ : اگر وہ چاہے
يُذْهِبْكُمْ : تو وہ لے جائے تم لوگوں کو

وَيَاْتِ : اور لے آئے
بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ : کوئی نئی مخلوق

وَّمَا ذٰلِكَ : اور یہ نہیں ہے
عَلَى اللّٰهِ : اللہ پر

بِعَزِيْزٍ : کوئی مشکل
وَبَرَزُوْا : اور وہ لوگ سامنے آئیں گے

لِلّٰهِ : اللہ کے لیے
جَمِيْعًا : سب کے سب

فَقَالَ : پھر کہیں گے
الضُّعَفٰٓؤُا : ضعیف لوگ

لِلَّذِيْنَ : ان سے جنہوں نے
اسْتَكْبَرُوْٓا : بڑائی چاہی

اِنَّا كُنَّا : بے شک ہم تھے
لَكُمْ تَبَعًا : تمہاری پیروی کرنے والے

فَهَلْ اَنْتُمْ : تو کیا تم لوگ
مُّغْنُوْنَ : دور کرنے والے ہو

عَنَّا : ہم سے
مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ : اللہ کے عذاب میں سے

مِنْ شَيْءٍ : کچھ بھی
قَالُوْا : وہ لوگ کہیں گے

لَوْ هَدٰىنَا : اگر ہدایت دیتا ہم کو

لَهَدَيْنٰكُمْ : تو ہم ضرور ہدایت دیتے تم کو

عَلَيْنَآ : ہم پر

اَمْ صَبَرْنَا : یا ہم صبر کریں

مِنْ مَّحِيْصٍ : کوئی بھی بچنے کی جگہ

لَمَّا قُضِيَ : جب فیصلہ کر دیا جائے گا

اِنَّ اللّٰهَ : بےشک اللہ نے

وَعْدَ الْحَقِّ : حق کا وعدہ

فَاَخْلَفْتُكُمْ : پھر میں نے وعدہ خلافی کی تم سے

عَلَيْكُمْ : تم لوگوں پر

اِلَّآ اَنْ : سوائے اس کے کہ

فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ : پھر قبول کی تم لوگوں نے میری (دعوت)

وَلُوْمُوْٓا : اور ملامت کرو

مَآ اَنَا : میں نہیں ہوں

وَمَآ اَنْتُمْ : اور تم لوگ نہیں ہو

اِنِّيْ كَفَرْتُ : بےشک میں نے انکار کیا

مِنْ قَبْلُ : اس سے پہلے

لَهُمْ : ان ہی کے لیے ہے

وَاُدْخِلَ : اور داخل کیے گئے

وَعَمِلُوا : اور انھوں نے عمل کیے

جَنّٰتٍ : ایسے باغات میں

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ : جن کے نیچے سے نہریں

فِيْهَا : ان میں

تَحِيَّتُهُمْ : ان کی ملاقات کی دعا ہوگی

سَلٰمٌ : سلام

اللّٰهُ : اللہ

سَوَآءٌ : برابر ہے

اَجَزِعْنَآ : چاہے ہم غم کا اظہار کریں

مَا لَنَا : ہمارے لیے نہیں ہے

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ : اور کہے گا شیطان

الْاَمْرُ : تمام معاملات کا

وَعَدَكُمْ : وعدہ کیا تم لوگوں سے

وَوَعَدْتُّكُمْ : اور میں نے وعدہ کیا تم سے

وَمَا كَانَ لِيَ : اور نہیں تھا میرے لیے

مِّنْ سُلْطٰنٍ : کوئی بھی اختیار

دَعَوْتُكُمْ : میں نے دعوت دی تمہیں

فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ : پس تم لوگ ملامت مت کرو مجھ کو

اَنْفُسَكُمْ : اپنے آپ کو

بِمُصْرِخِكُمْ : تمہاری فریاد رسی کرنے والا

بِمُصْرِخِيَّ : میری فریاد رسی کرنے والے

بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ : اُس کا جس میں تم نے شریک کیا مجھ کو

اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ : بےشک ظالم لوگ

عَذَابٌ اَلِيْمٌ : ایک دردناک عذاب

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا : وہ لوگ جو ایمان لائے

الصّٰلِحٰتِ : نیکیوں کے

تَجْرِيْ : بہتی ہیں

خٰلِدِيْنَ : ہمیشہ رہنے والے ہوتے ہوئے

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ : اپنے رب کے حکم سے

فِيْهَا : ان میں

(باقی صفحہ 74 پر)

الفاظ کی جادوگری کا فتنہ

ڈاکٹر محمد رشید ارشد

(چند سال قبل راول پنڈی کے ایک علمی ادارے میں دیا گیا لیکچر)

غالباً جنرل ضیاء الحق صاحب کا دور تھا۔ اس وقت ایک سیاسی اتحاد تھا جو قومی اتحاد کہلاتا تھا۔ اس اتحاد میں شامل جماعتیں حکومت کا بھی حصہ تھیں۔ ان میں سے ایک' جماعتِ اسلامی بھی تھی جو کچھ عرصہ حکومت میں رہی۔ جماعتِ اسلامی کی طرف سے محمود اعظم فاروقی صاحب وزیرِ اطلاعات تھے۔ سلیم احمد صاحب ان کے مشیر رہے۔ کچھ عرصہ پہلے محمود اعظم فاروقی صاحب کا ایک مضمون پڑھا' جس کا عنوان تھا: ''قوم اور دانشور''۔ اس کا آغاز انہوں نے ایک بہت اچھے جملے سے کیا تھا کہ: ''موجودہ زمانہ فتنۂ الفاظ کا زمانہ ہے۔''

یہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کی ابتدا کی بات ہو رہی ہے۔ اب اس بات کو تقریباً چالیس سال ہونے کو آ رہے ہیں۔ جب انہوں نے یہ بات کہی تھی اس وقت تو شاید یہ فتنہ اتنا زیادہ ظاہر نہیں ہوا تھا' لیکن اب موجودہ دَور میں تو یہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ پہلے عام لوگوں کی گفتگو' ان کا کلام' ان کا مکالمہ نج میں ہوتا تھا' یعنی اپنے دوستوں اور رشتے داروں میں یا پھر اپنے حلقے میں شامل چند لوگوں تک ان کی بات پہنچتی تھی۔ عام لوگوں کے برعکس ایک ایسا طبقہ جس کی آواز عوام میں سنی جاتی تھی' وہ دانش ور ہوتے تھے' جن میں اساتذہ بھی شامل تھے۔ یہ ایک خاص طبقہ تھا جو گفتگو اور کلام کرتا تھا اور لوگوں سے مخاطب ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ الفاظ کا فتنہ ان دانش وروں اور اساتذہ کے کلام تک محدود تھا' کیونکہ ان کے پاس اپنی بات پہنچانے کے لیے نسبتاً ایک وسیع پیمانے پر سامعین ہوتے تھے۔ اسی طرح سیاست دانوں کے پاس بھی یہ موقع ہوتا تھا۔ اس زمانے میں بھی ان کی باتیں میڈیا' اخبارات اور جرائد کے ذریعے پہنچتی تھیں۔ اسی طرح شاعر اور ادیب تھے' وہ بھی بہرحال قوم سے گفتگو کرتے تھے۔ جیسے اقبال نے بھی کہا ہے کہ شاعر قوم کا دیدۂ بینا ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں چونکہ شعور کی سطح اتنی بلند نہیں ہوتی' اس لیے وہ اپنے روزمرہ کے معمولات سے اٹھ کر سوچنے پر کم ہی آمادہ ہوتے ہیں۔ دانش ور' سیاست دان' ادیب اور استاذ وہ لوگ ہیں جن کا شعور بلند ہوتا ہے۔ لفظ سے ان کا تعلق گہرا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ نفسیات' زبان اور تہذیب کا نسبتاً گہرا علم رکھتے ہیں اور لوگوں سے کلام بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح صحافیوں کے پاس بھی کالم لکھنے اور خبریں بنانے کا موقع ہوتا تھا۔

آج جس دور میں ہم ہیں' اس میں تو یہ فتنہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ پہلے دانش وروں کا ایک محدود سا طبقہ ہوتا

تھا‘ لیکن اب دانش وری کی وبا بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر آدمی کے پاس اپنی آواز پہنچانے‘ اپنی بات کہنے کا ایک میڈیم موجود ہے اور اس پر کوئی زیادہ خرچ بھی نہیں اٹھتا۔ سوشل میڈیا‘ فیس بک‘ انسٹا گرام‘ ٹویٹر‘ واٹس ایپ کے اندر مختلف فورمز ہیں اور وہاں لوگ اپنی بات کرتے اور رائے دیتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اب یہ معاملہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ محمود اعظم فاروقی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک ایسے بازار میں کھڑے ہیں جس میں بے شمار سودے والے چیخ چیخ کر اپنا سودا بیچ رہے ہیں۔ ہر بیچنے والے کا اپنا ایک مخصوص نعرہ ہے‘ اور ہر نعرہ لگانے والا بس یہ چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے مال پر ٹوٹ پڑیں۔ اِس وقت بھی اگر کوئی ٹویٹ کرتا ہے‘ فیس بک وغیرہ پر کوئی شعر لکھتا ہے تو پھر بار بار اس کو دیکھتا ہے کہ میرا ٹویٹ کتنا ری ٹویٹ ہوا‘ فیس بک پوسٹ کو کتنے لوگوں نے شیئر کیا‘ یا کوئی وڈیو اَپ لوڈ کی ہے تو کتنے لوگوں نے اس کو دیکھا ہے۔ پہلے جو لوگ رسالوں اور جرائد میں لکھتے تھے‘ ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کتنے لوگ رسالہ پڑھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر رسالہ پڑھے بھی تو میرا مضمون کتنے لوگوں نے پڑھا! اب بہت سے ویب میگزینز ہیں جن میں لوگوں کو پتا لگ جاتا ہے کہ کتنے لوگوں نے اس کو پڑھا ہے‘ یا اس کو دیکھا ہے اور کتنے لوگوں نے اسے شیئر کیا ہے۔ سلیم احمد صاحب کہا کرتے تھے کہ لوگ اِدھر اُدھر بھاگتے رہتے ہیں‘ کبھی اِس سودے کے پیچھے کبھی اُس سودے کے پیچھے اور آخر میں ان کی جیب بھی خالی ہوتی ہے اور ان کے ذہن بھی خالی ہوتے ہیں‘ یعنی ان کے پلّے کچھ ہوتا ہی نہیں۔

اس صورتِ حال میں صحیح رائے کیسے قائم کی جائے؟ یہ جو ہمارے سامنے الفاظ کی ایک بازی گری ہو رہی ہے‘ اس کو ہم کیسے دیکھیں اور اس کے بارے میں ہمیں کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیے؟ اس کو ایک خاص پہلو کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ زیادہ تر چیزیں پہلے مغرب میں سامنے آتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ہمارے یہاں بھی سرایت کر جاتی ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس وقت جو کیپٹل ازم ہے‘ اس کی پیدائش یورپ میں ہوئی تھی‘ لیکن سو سال کے لگ بھگ ہو گئے کہ اب موجودہ تہذیب کا قائد امریکہ ہے۔ ہمارا پڑوسی ملک بھارت کیپٹل ازم کے خیالات کو قبول کرنے میں بہت جلدی کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں ایک اور میڈیم سے گزر کر یہ چیزیں آتی ہیں‘ یعنی پہلے امریکہ میں آئیں گی‘ وہاں سے بھارت میں آئیں گی اور پھر پاکستان آئیں گی۔

ایک اور چیز جو ہمارے ہاں وبا کی طرح پھیل رہی ہے‘ اور اس میں بھی کچھ لوگوں نے مذہبی پہلو کو شامل کر دیا ہے‘ جسے موٹیویشنل اسپیکنگ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح success کے حوالے سے بہت سا لٹریچر چھپتا ہے۔ پچیس تیس سال پہلے اس نوعیت کا لٹریچر آتا تھا تو اُس وقت ڈیل کارنیگی ان موضوعات پر بہت مشہور آدمی تھا۔ اس کی کتابیں ترجمہ بھی ہوتی تھیں اور عام بھی ہوتی تھیں۔ Edward de Bono ایک مشہور آدمی تھا‘ جس کی کتابیں کسی زمانے میں مشہور تھیں۔ اس کے بعد ایک طبقے نے خاص طور سے کاروبار اور مارکیٹنگ کے حوالے سے یا خرید و فروخت کے حوالے سے موٹیویشنل اسپیکنگ شروع کی۔ پھر یہ کام وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا اور اس میں

عمومی طور پر ہر انسان کو مخاطب کیا جانے لگا۔ ہر انسان کو کچھ گُر بتائے گئے کہ اگر وہ ان کو اختیار کرلے تو کامیابی اس کے قدم چومے گی۔ اس میں Stephen Richards Covey سے گویا ایک نیا آغاز ہوا اور The Seven Habits of Highly Effective People نے بہت شہرت حاصل کی۔ پھر ہمارے ہاں بھی اس قبیل کے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اس طرح کی کتابیں لکھیں' جو بہت فروخت بھی ہوئیں۔

اگلا مرحلہ یہ آیا کہ ان موضوعات پر گفتگو شروع ہوگئی اور بڑی بڑی مجالس کا انعقاد ہونے لگا۔ کارپوریٹ کلچر نے بھی اسے اپنانا شروع کر دیا۔ بڑی بڑی کمپنیاں موٹیویشنل اسپیکرز کو بلانے لگیں۔ واٹس ایپ پر چھوٹے چھوٹے کلپ آتے رہتے ہیں۔ بھارت میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ان باتوں کو بکثرت موضوع بنا کر فوری شہرت حاصل کر رہے ہیں۔ صاف لگتا ہے کہ جیسے ایک بازی گری ہو رہی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس میں مذہب اور روحانیت کا تڑکا بھی بہت لگایا گیا ہے۔ مولانا روم اور بلھے شاہ وغیرہ کو اس میں ڈال دیا اور دین و دنیا کا ''حسین امتزاج'' پیدا کر دیا۔ اس سے آگے بڑھ کر بہت سے ایسے لوگ جن کی شناخت دینی ہے' انہوں نے بھی اس اسلوب کو اختیار کرلیا۔ اب کچھ ایسے جدید ادارے بن گئے ہیں کہ جہاں اگر آپ اس آدمی کو کلام کرتے ہوئے دیکھیں تو لگے گا کہ اس میں خاص طرح کی آواز ہوتی ہے' آدمی لاؤڈ ہوتا ہے' بہت active ہوتا ہے' اس کی باڈی لینگوئج بہت زیادہ ہوتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ عام فہم انداز اختیار کیا جائے' بہت نیچے اتر کر گفتگو کی جائے۔ گفتگو میں ثقالت نہ ہو' گہرائی نہ ہو' اس کے اندر کوئی ایسی چیز نہ ہو جو مجمع سمجھ نہ سکے۔ ہم کسی کی نیت پر گفتگو نہیں کرتے اور نہ ہمیں اس کا حق ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کا بالکل فائدہ نہیں ہوتا۔ کچھ لوگوں کو یقیناً اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہوتا ہوگا' لیکن اس کا زیادہ تر اثر غیر حقیقی اور ناپائیدار ہے pseudo effect ہے۔ وہاں جو لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں ان کو بڑے لوگوں کی مثالیں دی جا رہی ہوتی ہیں' ان کے سامنے کامیاب لوگوں کی کہانیاں بیان کی جا رہی ہوتی ہیں اور وہ اس کو بہت تعجب خیز محسوس کرتے ہیں کہ گویا ہم بھی یہ کر سکتے ہیں' لیکن ہوتا کچھ بھی نہیں ہے۔ بس مختلف چیزیں جوڑ کر ایک تقابل کیا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ سب کچھ پرانے طرز کے کسی دیہاتی وعظ سے مشابہ نظر آتا ہے۔ یہ انٹرٹینمنٹ جیسی کوئی چیز ہوتی ہے۔ مختلف چیزیں لوگوں کے سامنے آتی ہیں' کبھی لوگ رونے لگتے ہیں' کبھی مسکرانے لگتے ہیں' لیکن جب وہ مجلس چھوڑ کر جاتے ہیں تو ان کے پلّے کچھ ہوتا نہیں ہے۔ بس وہ وہاں پر کچھ دیر کے لیے ایک اچھا وقت گزار لیتے ہیں۔ یہی حال موٹیویشنل اسپیکرز کا ہے۔

موٹیویشنل اسپیکنگ کا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اس میں جس چیز کی رٹ لگائی جاتی ہے اور بار بار اسے نمایاں کیا جاتا ہے وہ ہے success۔ ایسے لگتا ہے کہ گویا کامیابی پوجنے لائق کوئی چیز ہے۔ اصل میں یہ تصور کیپٹل ازم سے آیا ہے۔ امریکا میں اس کا بہت غلغلہ ہے۔ لینڈ آف ڈریمز اور کامیاب انسان کے اس تصور پر اہلِ مغرب بھی امریکہ کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ انہوں نے کامیابی کو جیسے ایک بُت بنا دیا ہے۔ لہٰذا پہلا مسئلہ اس پورے لٹریچر کا

یہی ہے کہ اس میں کامیابی اوراس کے تصور کو بیچا جاتا ہے۔ اگر کبھی ان لوگوں کی گفتگو سنیں تو سب سے بڑھ کر وہ اپنی ہی مثالیں دے رہے ہوتے ہیں۔ میں کیسے ایک موٹر سائیکل سے ایک بی ایم ڈبلیو تک آ گیا؟ پھر ایک کہانی سنائی جائے گی‘ جس میں فکشن بہت زیادہ ہوگا‘ یعنی اس میں حقیقت نہیں ہوگی‘ مگر اس سے آپ کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کامیابی اگرچہ بہت سی چیزوں میں ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے اس کے تصور کو سکیڑ کر اسے دولت اور شہرت تک محدود کر دیا۔ بنیادی طور پر یہی دو variables بتائے گئے کہ کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دولت اور شہرت حاصل کرے۔ دراصل یہ انسان کا ہمیشہ سے مسئلہ رہا ہے۔ روایتی صوفیانہ لٹریچر میں جب تفصیل بیان کی جاتی ہے کہ حُبِّ دنیا سے کیا مراد ہے تو یہی کہا جاتا ہے کہ یہ حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ ہے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے‘ کیونکہ انسان کے اندر یہ دو چیزیں ایسی رکھی گئی ہیں کہ وہ ان کا حریص ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’دو بھوکے بھیڑیے اگر بکریوں کے کسی ریوڑ میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ بھی اتنا فساد برپا نہ کریں جتنا مال اور جاہ کی حرص آدمی کے دین کو خراب کرتی ہے۔‘‘ (ترمذی: ۲۳۷۶)

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں انسانوں کے تنوع کو بھی سامنے نہیں رکھا جاتا‘ یعنی جن معنوں میں وہ کامیابی کہہ رہے ہیں وہ ہمیشہ انسانوں کی اقلیت کو حاصل ہوتی ہے‘ اکثریت کو نہیں۔ اگر وہ سارا مجمع بھی کوشش کر لے تو پچاس لوگوں میں مشکل سے پانچ افراد وہ حاصل کر پائیں گے۔ یعنی یہ The Divine scheme of things کے خلاف ہے‘ ایسا ہوتا بھی نہیں ہے۔ اگر آپ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو مانتے ہیں تب تو آپ کو یہ بات سمجھنی چاہیے اور اگر نہیں مانتے تو ایک demographic survey کے ذریعے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ انسانوں کے اندر بہت زیادہ تنوع ہے۔ کوئی نسخہ جو آپ نے استعمال کیا اور آپ کے لیے اس میں کامیابی کی راہ کھل گئی‘ لازمی نہیں ہے کہ اگر دوسرا اسے اختیار کرے تو اس کے لیے بھی وہ راہ کھل جائے۔ چنانچہ انسانی فطرت اور انسانی شخصیت کے اندر جو تنوّع اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے اس کی نفی کر دی جاتی ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک فیکٹری سے جیسے صابن کی ٹکیاں بن بن کے نکلتی ہیں‘ انسانوں کو بھی ایسے بنایا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں ایسا ممکن نہیں ہے۔

تیسرا مسئلہ جو اس طرح کے لٹریچر اور گفتگو میں پیدا ہو گیا ہے یہ ہے کہ اس میں روحانیت یا دین کو شامل کر دیا گیا۔ گویا دین کا بھی مقصود یہی ہے کہ آپ ’’کامیاب‘‘ ہوں۔ قرآن وحدیث اور صوفیانہ لٹریچر کو اس میں شامل کر دیا جاتا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ بھی یہی چاہتا ہے۔ امریکی سوشیالوجسٹ کرسچین سمتھ نے امریکی teenagers کی ایک sociological study کی اور کہا کہ ان لوگوں کے اندر operative religion ہے۔ اس کا اس نے ایک نام رکھا اور کہا کہ وہ operative مذہب Moralistic therapeutic deism ہے۔ اس تصور سے مراد یہ ہے کہ ایک خدا ہے‘ اس نے انسانوں اور دنیا کو پیدا کیا‘ خدا انسانوں سے بہت محبت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان خوش رہیں‘ کامیاب ہوں۔ وہ جس کو امریکہ میں feel-good expression کہتے ہیں۔ یعنی انسان اپنے بارے میں اچھا سوچیں‘ اچھا خیال کریں۔ خدا

انسانوں کی زندگی میں کوئی بہت زیادہ مداخلت نہیں کرتا اور اس خدا کی ضرورت بس ایک مسئلہ حل کرنے والے کی ہوتی ہے۔ جیسے کوئی مسئلہ ہو جائے تو کسی تھراپسٹ کے پاس جاتے ہیں' اس سے علاج معالجہ کرواتے ہیں' بس خدا کا عمل دخل اتنا ہی ہے۔ deism اس کو اس لیے کہا گیا کہ اس میں خدا ایک زندہ حقیقت کے طور پر' ایک حیّ و قیوم ذات کے طور پر' اس کائنات کو چلانے والا' اس کائنات میں لوگوں کو راہ دکھانے والا نہیں ہوتا' بلکہ کچھ اخلاقی باتیں ہیں اور وہ بھی اس طرح کی ہیں کہ جیسی ہمارے ہاں میڈیا میں عموماً اینکر پرسنز استعمال کرتے ہیں کہ خوش رہیں' اپنا خیال رکھیں وغیرہ۔ گویا سب سے بڑی قدر یہی ہے کہ بس آپ خوش رہیں' خود کو وقت دیں۔ ایسے تصورات میں مذہب کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ امریکہ میں ایک خاص دور میں جس کو The gospel prosperity یا The gospel of health and wealth کہا جاتا تھا' ان تصورات کی ترویج کی گئی کہ اصل میں خدا بھی یہی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بے تحاشا پیسہ ہو' آپ بہت صحت مند ہوں' آپ اپنے جسم پر توجہ دیں' اپنی جیب پر توجہ دیں۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب دین کو دنیاوی اغراض کے لیے ہی استعمال کیا جائے تو پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دنیا بھی حاصل نہیں ہو پاتی اور دین کا تصور تو ویسے ہی برباد ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو اس مقصد کے لیے نہیں کہی گئیں' جب وہ توڑ مروڑ کر وہاں فٹ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر اس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ایک دولختی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آپ دنیا چاہتے ہیں تو دنیاداروں کی بود و باش اور ان کا ڈسکورس اختیار کر کے وہ چیزیں حاصل کر لیں' لیکن اس کے لیے اگر آپ دینی دلائل تراشیں گے تو اس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

ایک بہت اہم بات جو اس طرح کے لٹریچر میں سامنے نہیں لائی جاتی وہ یہ کہ اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ دولت اور شہرت مقصود ہیں تو اس کے حصول میں ایک بہت بڑے عامل کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ عامل یہ ہے کہ اگر آپ خدا کو مانتے ہیں تو اسے تقدیر یا خدا کا امر کہہ لیں' اور اگر نہیں مانتے تو اسے قسمت یا حالات کہہ لیں' ان کا کسی کی کامیابی میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ وہ لوگ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بہت کامیاب ہیں اور ان کی سوانح عمریاں بہت بکتی بھی ہیں' اگر ان کو غور سے پڑھیں تو یہ احساس ہو جائے گا کہ کئی ایسے عوامل ان لوگوں کے لیے جمع ہو گئے تھے جو ان کے اپنے اختیار میں نہیں تھے اور انہی کی وجہ سے انھیں یہ کامیابی ملی۔ بل گیٹس اور ایمازون کے صدر کے اس طرح کے بیانات موجود ہیں۔ بل گیٹس نے کہا کہ میں وہی ہوتا' میری صلاحیت وہی ہوتی' میں اتنا ہی ماہر ہوتا' تب بھی میں اتنا کامیاب نہ ہوتا اگر امریکہ میں نہ ہوتا۔ یعنی امریکہ کا نظام' ریاست اور مارکیٹ اس طرح کے لوگوں کی کامیابی کے لیے سازگار ہے۔ بہرحال اتنے سارے عوامل ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے لیکن وہ اس کی کامیابی کا سبب بن رہے ہوتے ہیں۔

اس طرح کی کتابوں میں جو چیز بہت زیادہ اور بار بار سامنے آتی ہے وہ یہ تصور ہے کہ انسان گویا اپنی تقدیر کا خود مالک ہے۔ جیسے یہ کہنا مقصود ہو کہ تم جو چاہو کر سکتے ہو' جو چاہو پا سکتے ہو' اور تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ گھمنڈ بجائے خود انسان کے اخلاق اور اس کی شخصیت کو کُلّی طور پر مار دینے والا ہے۔ یہ تصور کہ

میں خودمختار ہوں اور جو چاہوں حاصل کرسکتا ہوں‘ اس سے جو تکبّر پیدا ہوتا ہے وہ اپنے اوپر جھوٹے اعتماد کو جنم دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے آدمی کے اندر توکّل کی صفت بہت کمزور ہوجاتی ہے اور دعا کے ساتھ اس کا رشتہ بہت کمزور پڑ جاتا ہے۔ جب انسان کی سوچ یہ ہوجائے کہ مجھے اپنے اوپر ہی اعتماد کرنا ہے‘ اپنے معاملات کو خود دیکھنا ہے اور اپنے وسائل پر بھروسا کرنا ہے‘ تو اس سے بھی انسان کی شخصیت بہت گھٹیا اور کمزور پڑ جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد امارت اور غربت کا ذمہ دار بھی انسان خود کو قرار دیتا ہے۔ ایک مشہور جملہ ہے کہ اگر آپ غریب پیدا ہوئے ہیں تو اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں‘ لیکن اگر آپ غریب مرے ہیں تو اس میں یقیناً آپ کا قصور ہے۔ ایسی ذہن سازی کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ غربت ایک لعنت ہے۔ اگر اپنی روایات کو دیکھیں تو وہاں ایسا کوئی تصور نہیں ہے۔ مثلاً حدیث کی ایک معروف کتاب ’’ریاض الصالحین‘‘ میں ایک باب ہے: باب فضل الزهد في الدنيا والحثِّ على التَّقَلُّلِ منها، وفضل الفقر یا كتاب الرقاق، باب كيف كان عيش النبي ﷺ وأصحابه پڑھ لیں۔ ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور ہماری روایت کے بالکل برعکس ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ انسان اگر غریب ہے تو وہ غربت کا ذمہ دار ہے اور اگر امیر ہے تو بھی وہ امارت کا ذمہ دار ہے۔ اس سے لوگ بہت زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار ہوجاتے ہیں‘ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم کما نہیں پا رہے اور دُنیا میں آگے نہیں بڑھ پا رہے‘ تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارے اندر کوئی عیب اور اخلاقی نقص ہے اور اس کی بنیاد پر ہمیں اپنے اوپر ترس کھانا چاہیے اور اپنے آپ سے نفرت کرنی چاہیے۔ اسی وجہ سے آپ غریبوں کے ساتھ ہم دردی‘ محبت اور الفت کا تعلق نہیں رکھ سکتے۔ آپ کہیں گے کہ یہ نالائق ہیں اور اگر یہ دنیا میں پیچھے رہ گئے ہیں تو ان کا اپنا قصور ہے۔

آج کل مغرب کے اندر جو اخلاقیات پر مباحث ہو رہے ہیں‘ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ بہت سارے مما لک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فلاحی ریاستیں ہیں‘ خاص طور پر Scandinavian مما لک۔ وہ فلاحی ریاستیں اس وجہ سے بن پاتی ہیں کہ وہ haves اور have nots کی بنیاد پر ہیں۔ لیکن یہ تقسیم تو دنیا میں کبھی ختم نہیں ہوسکتی‘ یعنی آئیڈیل کے طور پر مساوات کا ایک تصور کہ سب لوگ برابر کردیے جائیں‘ یہ ناممکن ہے۔ ایک تو یہ منطقی طور پر ممکن نہیں ہے کہ تمام لوگوں کو یکساں مال دے دیا جائے۔ دوسرے‘ اگر یہ کر بھی دیا جائے‘ تب بھی مراتب باقی رہیں گے۔ یعنی اگر یہ طے کر دیا کہ ہر مہینے سب لوگوں کو دس ہزار روپے ملنے ہیں‘ تو کچھ لوگ ان میں سے سمجھ دار ہوں گے جو اس پیسے کو سنبھال لیں گے‘ اس میں سے کم کو خرچ کرنے پر اکتفا کریں گے جبکہ کچھ ان میں عیاش قسم کے ہوں گے جو پیسے کو اڑا دیں گے۔ چاہے ان کو ایک جیسے پیسے دیں‘ لیکن کچھ مہینے بعد وہ مراتب پھر سے قائم ہوجائیں گے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آئیں۔ پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ سب کو یکساں مواقع فراہم ہونے چاہئیں‘ لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر مواقع سب کے لیے فراہم کر بھی دیے گئے‘ تب بھی وہی بات آئے گی کہ انسان تو سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان میں صلاحیت‘ جذبے اور استطاعت کا فرق ہے۔

چنانچہ پھر وہی مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ اسی لیے اب مغرب کے اندر ایک تصور ہے کہ خاص رنگ‘ قوم‘ مذہب کے لوگوں کو دبایا گیا اور کچھ لوگوں کو ترجیح دی گئی‘ یعنی ایک امتیازی سلوک روا رکھا گیا۔ چنانچہ اب وہ لوگ جو دبے اور پسے ہوئے ہیں‘ ان کو استحقاق دیا جائے‘ کچھ زیادہ مواقع دیے جائیں۔ اگر یکساں مواقع فراہم کریں گے تو بھی کچھ لوگ پیچھے رہ جائیں گے‘ اس لیے تھوڑا سا غیر متناسب نظام رائج کرنا پڑے گا۔ یہ وہی بات ہے جسے ہمارے ہاں کوٹہ سسٹم کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ایسی یکسانیت پیدا کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ پھر فلاحی ریاست میں یہ ہوتا ہے کہ جو haves ہیں ان پر بہت زیادہ ٹیکس لگایا جائے۔ اب مغرب میں یہ بحثیں زیادہ ہو رہی ہیں کہ یہ نامناسب اور غیر اخلاقی ہے۔ اس پر یہ سوال اُٹھ رہا ہے کہ مَیں کچھ لوگوں کی نالائقی اور غربت کو کیوں بھگتوں! مجھے کس بات کی سزا دی جا رہی ہے۔ مَیں پیسے کما رہا ہوں اور میرے پاس مال ہے‘ آپ مجھ سے لے کر ان غریبوں اور مسکینوں کو دے رہے ہیں!

اس طرح کے ادب میں دولت‘ شہرت اور کامیابی کو اتنا زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے کہ غریبوں سے وحشت‘ نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ ہمیں پیچھے گرانے کا سبب بنیں گے‘ ہماری دولت میں سے بلاوجہ حصہ لے جائیں گے۔ پھر کامیابی کے ساتھ اس میں ایک اور تصور خوشی کا ہے‘ یعنی خوشی کے تصور کو غیر معمولی اہمیت دینا۔ ویسے تو خوشی ایک روحانی جذبہ بھی ہے‘ اور ہمارے ایک استاد فرمایا کرتے تھے کہ خوش رہنا ایک دینی ذمہ داری ہے‘ کیونکہ خوش آدمی شاکر بھی ہوتا ہے۔ ایسا آدمی جو ہر وقت اداس رہتا ہے‘ کم امکان ہے کہ وہ شکر گزار ہو‘ ان معنوں میں کہ میرے رب نے اپنی نعمتیں میرے لیے میسر کر رکھی ہیں۔ رمضان المبارک کی روایتیں ہم پڑھتے ہیں کہ ’’للصائم فرحتان ‘‘یعنی روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ اس میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ جب انسان اپنا روزہ افطار کرتا ہے تو وہ افطار سے خوش ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مَیں نے اُس کی نعمتوں سے اجتناب کیا تھا‘ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت مل گئی ہے تو میں فوری طور پر ان سے فائدہ اٹھاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ افطار میں تعجیل افضل ہے۔ ان معنوں میں خوشی ایک اچھی چیز ہے۔ لیکن خوشی بمعنیٰ لذت‘ اس نے خوشی کا تصور بہت زیادہ گرا دیا ہے۔

جیریمی بینتھم نے کہا تھا کہ اصل میں انسان کے دو ہی مالک اور ماسٹرز ہیں: الم اور لذت۔ یعنی انسان کی پوری شخصیت کو یہی دو چیزیں چلاتی ہیں۔ پھر اس کے نزدیک لذت کا لفظ خوشی سے بھی زیادہ ہلکا ہے‘ جس کو hedonism کہتے ہیں یعنی لذتوں کے پیچھے بھاگنا۔ ایک تو خوشی کا تصور اس سے پیدا ہوا‘ پھر اس کو اتنا زیادہ ابھارنا‘ حالانکہ انسان کے سب سے سچے احساسات المیاتی ہوتے ہیں‘ اور ہر انسان کو اس کا تجربہ ہے۔ یعنی خوشی میں اتنی گہرائی نہیں ہوتی جتنی غم میں ہوتی ہے۔ غم بہت گہرا ہوتا ہے اور اس کے اثرات بھی انسان پر بہت گہرے ہوتے ہیں۔ بہرحال‘ ایک تو خوشی کو پوجنے کی حد تک اہمیت دینا ہے‘ ظاہر ہے یہ رویہ ٹھیک نہیں ہے۔ انسان اصل میں اس دنیا میں اس لیے نہیں آیا کہ وہ یہاں خوش رہے‘ بلکہ اس دنیا میں ایک آزمائش کو گزارنے آیا ہے اور ایک

بندے کی حیثیت سے اپنی زندگی گزار کر جائے گا۔

ایک اور تصور مثبت سوچ کا ہے کہ آپ جیسا سوچیں گے دنیا میں ویسے ہی حالات شروع ہو جائیں گے‘ اور اسی کا عکس خارج میں نظر آئے گا۔ اچھا سوچیں گے تو آپ کے ساتھ اچھا ہوگا اور برا سوچیں گے تو آپ کے ساتھ برا ہوگا۔ یہ خیال بھی زیادہ تر دھوکا ہی ہے‘ ایسا نہیں ہوتا۔ اگر معاملات اتنے سادہ ہوتے تو اچھا سوچنے میں تو کوئی خرچہ نہیں ہوتا‘ سب لوگ ہی اچھا سوچنا شروع ہو جائیں۔ اسی طریقے سے رجائیت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے کہ امید ہونی چاہیے‘ لیکن بعض اوقات یہ بھی انسان کے لیے مضر ہو جاتی ہے۔ آخرت کے تصور کو ایک طرف رکھ کر بھی یہ امید مضر بن جاتی ہے کہ آپ بلاوجہ خوش کن آرزوئیں کرتے رہیں۔ آدمی کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ دین جو ہمیں ظن کے بارے میں کہتا ہے‘ تو اس میں بھی صرف یہ نہیں ہے کہ بدظنی بری چیز ہے‘ بلکہ کسی بنیاد کے بغیر حسنِ ظن میں بھی بہت زیادہ مبالغہ کرنا مضر ہے۔ اس سے بھی انسان کا نقصان ہو جاتا ہے۔ ایسے ادب میں رجائیت پر بہت زور ہوتا ہے لیکن اس کے نتائج بھی ویسے نہیں نکلتے۔ پھر یہ تصور کہ کامیابی محض چند عادتوں کو اختیار کرنے سے مل جائے گی‘ بہت زیادہ سادہ لوحی پر مبنی ہے۔ خالصتاً مادی تصورات کے تحت بھی ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی چند عادات اختیار کر لے اور ایک چیک لسٹ بنا لے کہ مَیں اپنے اندر یہ یہ چیزیں پیدا کر لوں تو ایسا ہو جائے گا۔ اسی لیے جو لوگ اسی طرح کا ادب زیادہ پڑھتے ہیں یا کسی موٹیویشنل اسپیچ میں جاتے ہیں‘ جب تک وہاں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں تو پُرجوش رہتے ہیں‘ ان میں ایک جذبہ اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے‘ لیکن بعد میں جب حقیقی زندگی میں آتے ہیں اور وہاں معاملات کرتے ہیں تو بہت زیادہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ وہاں بتایا گیا تھا کہ یہ یہ کرو گے تو ایسا ہو جائے گا‘ لیکن میرے ساتھ تو وہ نہیں ہو رہا۔ چنانچہ ایسا آدمی سمجھنے لگتا ہے کہ میں بہت ہی نکما اور بدقسمت ہوں۔ لہٰذا اس طرح کا ادب جو لوگ زیادہ پڑھتے ہیں یا اس طرح کی گفتگو میں زیادہ شرکت کرتے ہیں‘ ان کے ہاں ذہنی دباؤ اور اس نوعیت کی دیگر بیماریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ عموماً اداس اور غمگین رہتے ہیں۔

اس طرح کے ادب کے بارے میں ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے‘ جو بہت اہم اور صحیح ہے‘ کہ اس میں فرد کو بہت زیادہ اہمیت دے دی جاتی ہے جبکہ موجودہ دور کے معاشرتی ڈھانچے کو یک سر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ سلیم احمد صاحب کا ایک شعر ہے: ؎

عشق کو شاد کرے‘ غم کا مقدّر بدلے\
حسن کو اتنا بھی مختار نہ سمجھا جائے!

انسان اتنی بڑی چیز نہیں ہے اور نہ ہر آدمی اتنی طاقت رکھتا ہے۔ ایک اچھا شعر پچھلے دنوں سنا تھا: ؎

یہ مرا دل نہیں‘ دنیا ہے مری جان اسے\
تم فقط حسن سے تسخیر نہیں کر سکتے!

یہ میرا دل نہیں‘ دنیا ہے اور اس کو تسخیر کرنے کے لیے صرف خوب صورتی کافی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت کچھ درکار

ہے۔ اس طرح کا ادب اس بات سے صرفِ نظر کرتا ہے کہ اگر سسٹم کرپٹ ہے یا اس کے اندر ایک غیر معمولی طاقت ہے تو پھر افراد کچھ زیادہ کر نہیں سکتے۔ اس میں ایک اور اخلاقی طور پر سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پھر عدل کا نظام قائم کرنے یا اس استحصال کو ختم کرنے کی کوشش کرنے کا کوئی خیال آتا ہی نہیں ہے۔ سارا الزام فرد پر دے دیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ناکام ہے تو اس کا اصل ذمہ دار وہ خود ہی ہے۔

بہرحال اس نظام کے اندر ہی کچھ مسئلے اور خرابیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس طرح کا سارا ادب اصل میں سرمایہ داری کا معاون ہے کہ status quo رہے اور لوگ اس کو بدلنے کے بارے میں نہ سوچیں‘ بھلے اپنے بارے میں سوچتے رہیں کہ میرے اندر یہ فلاں فلاں صلاحیتیں ہیں یا نہیں۔ اگر میں وہ پیدا کروں گا تو میرے لیے وہ نتائج نکل آئیں گے‘ نہیں کر پایا تو نہیں نکلیں گے۔ اس تصور سے بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش میں تو لگا رہتا ہے مگر اس نظام میں موجود مسائل کو ٹھیک کرنے کی طرف اس کا خیال نہیں جاتا۔ اس طرح کا ادب پڑھنے کے بعد انسان کا شخصیت کے بارے میں جو تصور بنتا ہے وہ وہی ہے جس کے لیے ایرک فرام نے ایک اصطلاح استعمال کی تھی: The marketing corrector کہ آدمی کے لیے اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے آپ کو ایک قابلِ فروخت جنس بنانا ہے۔ باہر تو بہت عرصے سے یہ ہو رہا تھا‘ اب یہاں کے تعلیمی اداروں کے اشتہار میں بھی یہ بات آ رہی ہے کہ خود کو ایک اچھی جنس بناؤ‘ اپنے برینڈ کو بہتر کرو‘ یعنی اپنی قیمت بناؤ تاکہ تمہاری بولی زیادہ لگ سکے۔ ندا فاضلی کا ایک شعر ہے:

یہ شہر ہے کہ نمائش لگی ہوئی ہے کوئی
جو آدمی بھی ملا‘ بن کے اشتہار ملا

اس وقت ہمارے ہاں اگر اچھے اداروں میں جائیں اور طلبہ کو دیکھیں تو لگتا ہے جیسے وہ ایک پروڈکٹ بنے پھر رہے ہیں۔ اس کے اسباب میں صرف ملازمت نہیں ہے‘ اور بھی اسباب ہیں جن میں ایک خواتین کی توجہ حاصل کرنا ہے۔ یہ بھی ایک مرض ہے۔ خود کو فروخت کرنا ہی ہے‘ ایک اشتہار ہے کہ آدمی جیسے اپنے آپ کو بیچ رہا ہے اور اپنا سودا لگا رہا ہے۔ اس کو وہ commodification کہتے ہیں کہ ہر چیز ایک commodity بن جائے۔ ہر آدمی آپ کو زرِ مبادلہ کے طور پر دیکھے۔ میری اپنی ایک قیمت ہے‘ میری بولی کیا لگتی ہے۔ اکبر نے اس وقت کہا تھا کہ:ـ

نہیں پرسش کچھ اس کی الفتِ اللہ کتنی ہے
سبھی یہ پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے!

یعنی پہلے کسی کی قدر و قیمت اس سے ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کتنی ہے‘ تعلق مع اللہ کتنا ہے۔ اگر آپ اللہ والے ہیں تو آپ قیمتی ہیں۔ اب آپ کی قیمت آپ کی تنخواہ سے طے ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ باقی وہ نماز پڑھتا ہے‘ نہیں پڑھتا یا کردار میں کیسا ہے‘ یہ باتیں اتنی اہم نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علم کے مقاصد بہت گھٹیا

ہو چکے ہیں۔ علم کا جو مقصد پرانے لوگوں نے بتایا' یا جو ارسطو کے زمانے سے چلا آ رہا ہے کہ علم کا اصل مقصد ''معرفت'' ہے' یعنی حقیقت کی تلاش اور حق کی معرفت۔ اس سے کم درجے پر یہ مقصد تھا کہ ایک اچھی' پاکیزہ اور سعادت والی زندگی بسر کرنا۔ تیسرے درجے میں یہ تھا کہ کوئی ہنر' طاقت یا صلاحیت ہونی چاہیے جس کے ذریعے آپ کچھ کھا کما سکیں۔ اب بہرحال تصورات کافی بدل چکے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا کہ: ؎

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے فقط دو کفِ جو

اور ؎

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا' جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

بہرحال' اب یہ موٹیویشنل اسپیکنگ اور لٹریچر کی وبا بہت پھیلتی جا رہی ہے' اور ہم لوگ بھی اس طرح کی چیزوں کو بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ ان چیزوں کا ہم پر اثر نہ ہو' ان کا ہم پر اثر ہوتا ہے۔ چاہے ہم اس طرح کی چیزوں کو تفریح کے لیے سنتے رہیں یا وقت گزارنے کے لیے' اس کی تاثیر ہم پر ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ وہ اس کا بہت دھیان کرتے تھے کہ کوئی بھی چیز لوگوں کو ان کے اصل مقصد سے دور نہ کرے۔ ایک مرتبہ یمن سے کپڑا آیا' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے' اور اسے بہت پسند کرنے لگے تھے۔ اس پر نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو جنت میں جو ناک پونچھنے کا رومال دیا گیا ہے وہ اس سے زیادہ افضل ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ آپ ﷺ بات کو یک دم وہاں لے گئے کہ کہیں لوگ دنیا کی طرف راغب نہ ہو جائیں۔ لہٰذا اس طرح کا ادب پڑھنے سے یا ویڈیوز دیکھنے سے بہت مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ زیادہ تر دھوکا اور فریب ہے اور جن مقاصد کے لیے لوگ ان چیزوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں' وہ بھی حاصل نہیں ہوتے۔ اصل میں سب لوگ تقریباً شکست خوردہ ہی ہوتے ہیں جبکہ فاتح وہ ایک صاحب ہوتے ہیں جو یہ چورن بیچ رہے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس سارے معاملے کے روحانی مضرات بھی لوگوں پر ہوتے ہیں۔ احتیاط اسی میں ہے کہ ان چیزوں پر کان دھرنے کے بجائے حقیقت پسندی کے ساتھ حالات کا جائزہ لیا جائے تاکہ کسی قسم کی مایوسی اور ناامیدی کا سامنا نہ ہو!

۞۞۞

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

تفسیر موضح القرآن

(اردو کی معروف تفاسیر میں اوّلین)

ڈاکٹر عظمیٰ خاتون ☆

مفسر کا تعارف

شاہ عبدالقادر کی پیدائش ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۳ء میں ہوئی۔ یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بن شاہ عبدالرحیم دہلویؒ مترجم ''فتح الرحمٰن'' ترجمۂ فارسیٔ قرآن' کے تیسرے بیٹے تھے۔ شاہ صاحب کو قرآن سے قلبی اور روحانی لگاؤ تھا۔ ان کی شخصیت ایک مردِ مومن اور متقی کی سی تھی۔ تصوّف کا رنگ غالب تھا۔ مولانا کو فلسفہ' منطق اور معقولات اور متکلّمین کے مسائل سے اگرچہ کوئی دلچسپی اور لگاؤ نہ تھا لیکن اس معاملے میں پوری معلومات رکھتے تھے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے اردو زبان کا پہلا بامحاورہ ترجمہ قرآن ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۰ء میں مکمل کیا۔ ان کے ترجمہ وتفسیر (موضح القرآن) کو سامنے رکھ کر سینکڑوں علمائے خلف نے قرآن کے ترجمے کیے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد شاید ہی کوئی مترجم ہو گا جو ان کے ترجمۂ قرآن کا مرہونِ منّت نہ ہو۔ انہوں نے یہ ترجمہ کر کے اسلامی ادب کے ساتھ اُردو ادب پر بھی بڑا احسان کیا ہے۔ شاہ صاحب کا انتقال ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۴ء میں ہوا اور اپنے جدِّامجد شاہ عبدالرحیم کی پائینتی میں آسودۂ خاک ہوئے۔ اِنَّا للہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون!

تفسیر کا تعارف

مولانا شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ پہلے قلمی نسخوں کی صورت میں تحریر کیا جاتا رہا۔ پہلی مرتبہ اس کی اشاعت سید عبداللہ بن سید بہادر علی نے دہلی کے مطبع احمدی سے کرائی۔ اس ایڈیشن پر تاریخ طبع ۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء لکھی ہوئی ہے۔ دوسرا ایڈیشن ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل تھا۔ پہلی جلد سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الکھف' دوسری جلد سورۂ مریم سے سورۃ الناس پر مشتمل ہے۔ ''موضح قرآن'' کے ساتھ پہلی مرتبہ دہلی کے مطبع احمدی سے ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء میں طبع ہوا۔ اس کا پشتو ترجمہ از محمد فتح اللہ قندھاری' نائب مفتی ریاست بھوپال ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء بھوپال کے مطبع سکندری سے طبع ہوا تھا۔ اس کے قلمی نسخے رضا لائبریری' رام پور اور ادارۂ ادبیات' حیدر آباد دکن میں موجود ہیں۔ شاہ عبدالقادر کی تفسیر موضح قرآن کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ان میں سے دو نسخے میرے زیر مطالعہ ہیں:

☆ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ' بھارت

(۱) اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ کی لائبریری میں موجود نسخہ موضح قرآن کے ساتھ پہلی بار دہلی سے ۱۸۶۸ء میں انڈین پرنٹنگ ورکس' کچہری روڈ' لاہور سے طبع ہوا تھا۔اس کے ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز تھے۔اس میں ہر آیت کے ساتھ اس کا ترجمہ اور اس کی تفسیر درج ہے۔ یہ جلد ۶۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) دوسرے نسخے پر سن اشاعت ۱۳۲۱ھ مطبع ہاشمی میرٹھ' باہتمام محمد سراج ہاشمی درج ہے۔ اس کی ضخامت ۸۴۷ صفحات ہے۔طول سوا چودہ انچ اور عرض پونے گیارہ انچ ہے۔حروف خوبصورت اور جلی انداز میں ہیں۔ چکنے رنگین کاغذ پر قرآنی عربی متن کے ساتھ تحت السطور اُردو ترجمہ درج ہے۔حاشیہ پر تفسیر ''موضح قرآن'' لکھا ہے۔ پہلے صفحہ پر نقش و نگار کے اندر ''قرآن مجید مترجم فوائد موضح القرآن'' لکھا ہے۔اس کے نیچے مطبع درج ہے۔اسی صفحے کے نقش و نگار کے اندر قرآنی آیت لکھی ہوئی ہے۔دوسرے صفحے سے سورۃ الفاتحہ کا ترجمہ و تفسیر شروع ہو کر سورۃ الناس پر ختم ہوتی ہے۔جلد کے آخری صفحہ پر رموزِ اوقاف' بیان فضائل' اعتذار درج ہے۔ اس کے بعد سورۃ' رکوع' آیات' کلمات' حروف' امشار' اخماس' اعراب' نقاط' تشدیدات' مدات وغیرہ کے اعداد درج ہیں۔

(۳) موضح قرآن کا ایک اور نسخہ جو''سُنّی تھیالوجی ڈیپارٹمنٹ (علی گڑھ)''میں موجود ہے' باہتمام محمد ملک یار خاں نے خورشید عالم کمپنی' بالائی قلعہ علی گڑھ سے چھپوا کر شائع کیا۔جس کا سن اشاعت ۱۳۴۶ھ ہے۔ طول ۱۵ انچ' عرض سوا گیارہ انچ ہے۔بیل بوٹے کے اندر عمدہ سفید کاغذ' پیلے رنگ کی زمین پر قرآنی عربی متن اور تحت السطور اُردو ترجمہ موجود ہے۔حاشیہ پر ''موضح قرآن'' طبع ہے۔ ہر صفحے پر ۱۳ سطریں ہیں۔ کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہے۔جلد مضبوط اور خوبصورت ہے۔

تفسیر کے امتیازات مع امثلہ

موضح قرآن کو دو سو سال کا ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔جس عہد میں شاہ صاحب قرآن مجید کا ترجمہ کر رہے تھے' اُردو زبان حالتِ طفولیت میں تھی۔ اس کے باوجود ترجمہ میں حد درجہ روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ یہ ترجمہ اپنی شستگی اور عمدگی کی بناء پر ہر دور میں نظرِ تحسین سے دیکھا گیا۔

قدیم وجدید ترجموں میں شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔اس میں ایک نئی روش اختیار کرتے ہوئے اُردو زبان میں بامحاورہ ترجمہ قرآنی کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ اُردو ادب کی شاہکار تصانیف میں سے ایک ہے۔

آج سے تقریباً دو سو سال پہلے ان کے والد محترم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور برادرانِ اکبر شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ' شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ نے قرآن کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔اس خاندان کا ذکر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں بایں الفاظ کرتے ہیں:

''ترجمہ کی راہ ہندوستان میں اگر شاہ دہلویؒ اور ان کے خاندان والوں نے نہ کھول دی ہوتی تو آج خدا

معلوم کتنی دُشواریوں کا سامنا ہوتا۔''(۱)

شاہ عبدالقادرؒ نے اُردو کی ترتیب میں منطق و عقل کی گہرائی سے مطالعہ کیا اور تحت اللفظ ترجمہ کی سمجھ بوجھ کو محسوس کیا۔ اسی طرح سے بامحاورہ ترجمہ کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت قرآن حکیم کے بامحاورہ ترجمے کو علماء بڑے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے‘ لیکن شاہ صاحبؒ نے بڑی جرأت و ہمت اور دلیری سے اس ذمہ داری کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ ترجمہ بہت ہی مستند‘ ثقہ اور درست ہے۔ لسانی اعتبار سے اس قدر معیاری ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ دو سو سال قبل اتنا سادہ اور ادبی ترجمہ ظہور پزیر ہوا!

موضح قرآن کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں ایک ہی مادہ سے بنے ہوئے الفاظ کا موقع و محل‘ سیاق و سباق اور نظم کلام کی رعایت سے الگ الگ ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس سے قرآن کی غرض و غایت اور اس کا مقصد سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ دل و دماغ کو ایک خوش گوار تازگی ملتی ہے۔ اس کا اسلوب اتنا طبعی اور پُراثر ہے کہ زمانۂ جدید کے بعض تراجم سے بھی بہتر محسوس ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۰﴾ (الفتح)

''اور جو لوگ ہاتھ ملاتے ہیں تجھ سے‘ وہ ہاتھ ملاتے ہیں اللہ سے۔ اللہ کا ہاتھ ہے اوپر ان کے ہاتھ کے۔ پھر جو کوئی قول توڑے‘ سو توڑتا ہے اپنے بُرے کو‘ اور جو کوئی پورا کرے جس پر اقرار کیا اللہ سے‘ وہ دے گا اس کو نیگ بڑا۔''(۲)

سورۃ الممتحنہ کی ایک ہی آیت میں دو جگہ بیعت کا لفظ ہے۔ (الممتحنہ: ۱۲)

''اے نبی! جب آویں تیرے پاس مسلمان عورتیں اقرار کرنے کو اس پر‘ کہ شریک نہ ٹھہراویں اللہ کا کسی کو‘ اور چوری نہ کریں‘ اور بدکاری نہ کریں‘ اور اپنی اولاد نہ ماریں‘ اور طوفان نہ لاویں باندھ کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں‘ اور تیری بے حکمی نہ کریں کسی بھلے کام میں‘ تو ان سے اقرار کر‘ اور معافی مانگ ان کے واسطے اللہ سے۔ بےشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''(۳)

شاہ صاحبؒ نے بیعت کا ترجمہ سورۃ الفتح میں ''ہاتھ ملانا'' کیا ہے اور سورۃ الممتحنہ میں اسی لفظ کا ترجمہ ''اقرار کرنا'' کیا ہے۔ ان مقامات کے مطالعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے قرآنی لفظ بیعت کا ترجمہ جہاں جو کیا ہے وہاں وہی مناسب اور بہتر ہے۔ ''ہاتھ ملانا'' اُردو کا محاورہ ہے۔ یہ عام طور سے بول چال میں استعمال ہوتا ہے۔ ہاتھ ملانا گویا قول و قرار پختہ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ سورۃ الفتح میں بیعت رضوان کا واقعہ مذکور ہے‘ اس میں مرد حضرات تھے۔ سورۃ الممتحنہ میں شاہ صاحبؒ نے اپنے پہلے معنی کو چھوڑ کر ''اقرار کرنا'' ترجمہ اس لیے کیا کہ یہاں ذکر عورتوں کا ہے۔ احادیث میں مذکور ہے کہ حضور اکرم ﷺ عورتوں سے بیعت لیتے وقت ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے تھے‘ بلکہ عورتوں سے بیعت کا طریقہ ان سے صرف قول و قرار لینا تھا۔ اگر یہاں بھی ''ہاتھ ملانا'' ترجمہ ہوتا تو اس سے اشکال میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس سے بچنے کے

لیے شاہ صاحبؒ نے ''اقرار کرنا'' ترجمہ کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی اتفاقیہ نہیں بلکہ قرآن وحدیث میں گہری بصیرت کا نتیجہ ہے۔

قرآن مجید کے بعض مقامات ایسے ہیں جہاں مختلف تاویلوں کی گنجائش ہے۔ موضح قرآن میں جامع الفاظ کے ذریعہ ترجمہ کر کے ان احتمالات کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ شاہ صاحبؒ اگر مختلف اقوال میں سے کسی ایک کو کسی خاص وجہ سے ترجیح دینا چاہتے ہیں تو اس کی طرف لطیف اشارہ کر دیتے ہیں' یا ان میں سے کوئی بھی قرآنی الفاظ سے قریب تر نظر نہیں آتا تو مجتہدانہ اور بصیرت افروز انداز میں قرآن کے مقصد سے قریب تر ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ:

﴿وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٨﴾﴾ (الزخرف)

''قسم ہے رسول کے اس کہنے کی' کہ: اے رب! یہ لوگ ہیں کہ یقین نہیں لاتے۔''(۴)

اکثر مترجمین ومفسّرین نے واؤ کو عطف مانا ہے جبکہ شاہ صاحبؒ نے واؤ بمعنی قسم لیا ہے اور بغیر کسی فعل کو محذوف مانے آیت کا نہایت عمدہ مفہوم بیان کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ اس ترجمہ کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ قرآن مجید کی نہایت مشکل آیات میں سے ایک ہے' جس میں نحو کا یہ پیچیدہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''وَقِيْلِهٖ'' میں ''واؤ'' کیسا ہے؟ اور اس لفظ کا تعلق اوپر کے سلسلۂ کلام میں کس چیز کے ساتھ ہے؟ مفسرین نے اس پر بہت کچھ کلام کیا ہے' مگر کوئی تشفی بخش بات مجھے ان کے یہاں نہیں ملی۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح بات وہی ہے جو شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ سے مترشح ہوتی ہے۔ یعنی اس میں ''واؤ'' عطف کا نہیں بلکہ قسمیہ ہے اور اس کا تعلق ''فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ'' سے ہے اور وقیلہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف پھرتی ہے' جس پر اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ کا فقرہ صریح دلالت کر رہا ہے۔''(۵)

شاہ صاحبؒ نے ترجمہ میں قرآنی ایجاز کی رعایت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ سورۃ البقرہ' آیت ۱۴۱ اور آیت ۲۸۶ میں شاہ صاحبؒ نے دونوں لفظوں ''عَلٰی'' اور ''لِ'' سے قرآن کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ عربی زبان میں ''عَلٰی'' اور ''لِ'' حروفِ جار کہلاتے ہیں۔ عَلٰی نقصان کے موقع پر اور لِ نفع کے محل میں مستعمل ہے۔ ان ہی حروف سے قرآن نے نفع ونقصان اور برائی اور بھلائی کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤١﴾﴾ (البقرۃ)

''وہ ایک جماعت تھی' گزر گئی۔ اُن کا ہے جو کما گئے وہ اور تمہارا ہے جو تم کماؤ۔''

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)

''اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی شخص کو' مگر جو اُس کی گنجائش ہے۔ اسی کو ملتا ہے جو کمایا' اور اسی پر پڑتا جو کیا۔''

شاہ صاحبؒ کے ترجمہ میں سادگی' فصاحت اور جامعیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ انہوں نے اس میں نہ

کوئی لفظ محذوف مانا اور نہ ہی کوئی اضافہ کیا۔ ایجاز کی خاطر فعل کو ظاہر نہیں کیا‘ مگر اس کے باوجود ترجمہ صاف ستھرا اور دل نشین ہے۔

شاہ صاحبؒ نے قرآنی بلاغت کا بھی بھرپور لحاظ کیا ہے۔ آیت کا مفہوم بڑی خوبی اور فصاحت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے زبان اور محاورے کا برمحل استعمال رکھنے کی بھی پوری کوشش کی ہے۔ آیت کے مفہوم نہایت سادہ انداز میں اُردو کے محاورہ کی چاشنی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ انہیں اُردو کے محاورات میں بڑی مہارت اور قدرت حاصل تھی۔ بطور نمونہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

﴿وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا﴾ (الکھف: ۴۲)

’’اور سمیٹ لیا اس کا سارا پھل‘ پھر صبح کو رہ گیا ہاتھ نچاتا اس مال پر جو اس میں لگایا تھا۔‘‘(۶)

’’ہاتھ نچانا‘‘ اُردو کا محاورہ ہے۔ یہ الفاظِ قرآنی سے قریب ہونے کے ساتھ صورت حال کا بہترین عکاس ہے۔ کسی انسان کو جب کوئی نقصان پہنچتا ہے تو فطری طور پر وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر نچانے اور اُلٹتے پلٹتے کہتا ہے: ہائے کیا ہو گیا۔ اس محاورے میں اظہارِ افسوس کے ساتھ اظہارِ تعجب بھی ہے۔

شاہ صاحبؒ کا ترجمۂ قرآن اپنے وقت کی نہایت بامحاورہ زبان میں ایجاز کی خوبی اور مفہوم کی درستی کے ساتھ ایک الگ مزہ دے جاتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ دیگر مترجمین کے برعکس قرآن کا مطلب واضح کرنے کے لیے قوسین میں اپنی جانب سے بڑھائے ہوئے الفاظ سے بے عیب ہے۔ یہاں ہر لفظ کا ترجمہ قرآنی متن کے نیچے اور پھر عبارت کے بامحاورہ رہنے کا کمال ملتا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اپنے مقدمہ تفسیر میں شاہ صاحبؒ کے ترجمے کی چند مثالیں پیش کی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ’’اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ چند فوائد عرض کیے ہیں ایسے ہی چند مثالیں بھی کسی موقع سے عرض کر دی جائیں‘ جن سے ہمارے معروضات کی تصدیق ہو جائے اور ناظرین کے لیے اطمینان و تسکین کا باعث ہو۔ سو اول ہی لے لیجیے۔ دیکھیے ’’بسم اللّٰہ‘‘ کا ترجمہ محاورہ کے موافق کیا‘ جس میں توضیح اور اختصار دونوں کی بقدر مناسب رعایت ہے۔ اس سے بہتر اور خوبصورت ترجمہ اُردو میں سمجھ میں نہیں آتا اور رحمٰن اور رحیم جو مبالغہ کے صیغے ہیں‘ ان کے مبالغہ کو بھی ظاہر فرما دیا اور لطیف اشارہ دونوں کے فرق مراتب کی طرف بھی کر گئے۔ جتنے تراجم سابقہ ہیں ان میں مبالغہ سے تعرض نہیں فرمایا۔ اس کے بعد سورۂ فاتحہ میں بھی رحمٰن اور رحیم کا ترجمہ ایسا ہی کیا گیا ہے۔ یوم الدین کا ترجمہ جملہ حضرات نے ’’روزِ جزا‘‘ یا ’’دن جزا کا‘‘ فرمایا ہے مگر شاہ صاحبؒ نے صاف لکھ دیا ہے کہ میں نے عوام کی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور عوام کے کلام میں جزا کا لفظ شائع اور مستعمل نہیں۔ دوسرے اہلِ لغت اور حضراتِ مفسّرین نے دین کے معنی جزا اور حساب دونوں فرمائے ہیں۔ ان وجوہ سے غالباً حضرت ممدوح نے جزا کے بدلے ’’انصاف‘‘ کا لفظ اختیار فرمایا کہ عوام میں بھی شائع ہے اور اس ایک لفظ میں جزا اور حساب دونوں آ گئے۔‘‘(۷)

موضح قرآن میں شاہ صاحبؒ نے جابجا ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ اس سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ اس وقت اُردو طفولیت کے دور سے گزر رہی تھی‘ اس لیے ممکن ہے کہ ہندی و

سنسکرت کے الفاظ بھی اُردو میں استعمال ہو رہے ہوں‘ جبکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ شاہ صاحبؒ کے پیشِ نظر ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ برادرانِ وطن بھی ہوں اور اس عالم گیر پیغام کو ان تک بھی پہنچانا چاہتے ہوں ۔مثلاً:

﴿ وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ ؕ ﴾ (النساء :۱۲۸)

’’اور جیوں کے سامنے دھری ہے حرص ۔‘‘(۸)

’’الانفس ‘‘ کا ترجمہ ’’جیوں‘‘ ایک ہندی لفظ ہے۔

﴿ مَا لَکُمۡ مِّنۡ مَّلۡجَاٍ یَّوۡمَئِذٍ وَّ مَا لَکُمۡ مِّنۡ نَّکِیۡرٍ ﴿۴۷﴾ ﴾ (الشوریٰ)

’’نہ ملے گا تم کو بچاؤ اس دن‘ اور نہ ملے گا الوپ ہو جانا۔‘‘(۹)

’’الوپ‘‘ سنسکرت کا لفظ ہے۔

مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ جو با محاورہ ترجمہ کے بانی اور امام ہیں‘ انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں لوگ بہت سی زبانوں سے انجان ہیں۔ ناواقف لوگوں کو اس زبان سے متعارف کرانے کے لیے با محاورہ ترجمہ ضروری سمجھا گیا‘ کیونکہ ہندوستانیوں کو قرآن شریف کے سمجھنے میں جس قدر آسانی ایسے ترجمے سے ہو سکتی ہے‘ تحت اللفظ ترجمہ سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف ممدوحین کے بعد اس زمانہ میں جس نے اس میدان میں قدم رکھا اس نے شاہ صاحبؒ ممدوح کا اتباع کیا اور با محاورہ ترجمہ کرنے ہی کو اختیار کیا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کو سامنے رکھ کر اپنا ترجمہ لکھا ہے۔ یہ شاہ صاحبؒ کے ترجمے کے تقریباً ایک سو بیس سال بعد لکھا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں دو امور کی نشان دہی کی ہے جو شاہ صاحبؒ کے ترجمے کے ہوتے ہوئے بھی ایک نئے ترجمے کی ضرورت کی وجہ بنے:

’’......امر اول کی بابت جہاں تک ہم نے ملاحظہ کیا اور دیگر حضرات نے بھی اس کی تصدیق فرمائی‘ کل دو باتیں ایسی پائیں جس کی وجہ سے عام طور پر لوگ ترجمہ موصوف سے نفع اُٹھانے میں قاصر ہیں۔ اول بعض کلمات و محاورات کا اس زمانہ میں متروک یا قریب بمتروک ہو جانا۔ دوسرے چونکہ حضرت شاہ صاحب مرحوم کلماتِ قرآنی کی موافقت اور مطابقت کا خیال زیادہ فرماتے ہیں اور شرائطِ ترجمہ کی پابندی بہت کرتے ہیں‘ اس لیے بعض مواقع پر بوجہ اختصار عبارت آج کل کی سہولت پسند طبائع کو مطلب سمجھنے میں بہت دقّت معلوم ہوتی ہے۔ باقی رہا امر ثانی‘ تو یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں اُردو با محاورہ طرز پر بکثرت تراجم یکے بعد دیگرے شائع ہو چکے ہیں۔ سو ان میں بالیقین بعض ایسے تراجم بھی ہیں جو علمائے معتبر اہل علم و دیانت کی لوجہ اللہ سعی کا نتیجہ ہے ...... اور ظاہر ہے کہ اُس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ ترجمہ کلام الٰہی کے متعلق اب ہم کچھ ارادہ نہ کرتے‘ مگر تقدیر الٰہی سے یہ بات دل میں جم گئی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا افضل و مقبول و مفید ترجمہ رفتہ رفتہ تقویم پارینہ نہ ہو جائے ...... اور یہی بات دل نشین ہوگئی کہ مستقل ترجمہ سے یہ امر زیادہ مناسب اور مفید ہے کہ موضح قرآن میں جو شکایت پیدا ہوگئی ہے اس کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے ...... ؎

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر ۔۔۔ میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا!‘‘(۱۰)

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے شاہ صاحبؒ کے ترجمے کی تعریف متعدد صفحات میں فرمائی ہے۔ بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''اور یہ امر بھی خوب معلوم ہے کہ شاہ رفیع الدینؒ کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے تحت لفظی ترجمہ کا التزام کر کے ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ایسے ہی حضرت مولانا عبدالقادرؒ کا کمال یہ ہے کہ بامحاورہ ترجمہ کا پورا پابند ہو کر نظم و ترتیب' کلمات قرآن اور معانی لغویہ کو اس حد تک نبھایا کہ زیادہ کہتے ہوئے تو ڈرتا ہوں مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ ہم جیسوں کا ہرگز کام نہیں۔ اگر ہم ان کے کلام کی خوبیوں کو اور ان اغراض اور اشارات کو جو ان کے سیدھے سیدھے مختصر الفاظ میں ہیں' سمجھ جائیں تو ہم جیسوں کے فخر کے لیے یہ امر بھی کافی ہے۔''(۱۱)

حضرت شیخ الہندؒ نے شاہ صاحبؒ کے ترجمہ کے فنی اور تنقیدی پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس ترجمہ کی اول خوبی یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ ترتیبِ قرآنی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اصل اور ترجمہ کی مشابہت میں بہت زیادہ کوشش فرماتے ہیں۔ چونکہ ترجمہ بامحاورہ کا التزام کیا ہے' اس لیے بضرورت توضیح وتسہیل بعض مواقع میں تقدیم وتاخیر لازم ہے۔ فصل بعید سے احتراز کرتے ہیں' مگر کسی خاص ضرورت کے وقت میں دو تین کلموں کا فصل ہو جائے تو اُردو کے محاورے میں مضاف' مضاف الیہ کو مقدم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''غلامِ زید'' کہتے ہیں تو ان کے محاورے میں ''زید کا غلام'' کہیں گے۔ سو ترتیب بدل گئی لیکن دونوں کلموں کے درمیان فاصلہ اور فرق کچھ نہیں ہوا۔ اس لیے ضرورت کے وقت یہ تبدیل حالت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس قسم کی مثالیں شاہ صاحبؒ کے ترجمے میں کثرت سے ملتی ہے۔ مثلاً '' خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى سَمۡعِهِمۡ ؕ وَعَلٰٓى اَبۡصَارِهِمۡ '' کا ترجمہ بامحاورہ کریں گے تو ''اُن کے دل پر اور اُن کے کان پر اور اُن کی آنکھوں پر'' کیا جائے گا۔ اگر تحت لفظی ترجمہ کیا جائے تو ''اوپر دلوں ان کے کے اور اوپر کانوں ان کے کے اور اوپر آنکھوں ان کی کے'' کہنا پڑے گا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ ایسے اختلافات جتنے بھی ہو جائیں یا ہوں گے ان میں کوئی حرج نہیں بلکہ ضروری ہیں۔ بامحاورہ ترجمے کرنے والوں کو اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اس احتیاط کو قابلِ قدر اور تحسین بنایا ہے کہ اس پر بھی ہر جگہ مضاف الیہ کو مقدم نہیں کرتے' بلکہ جہاں ترجمہ میں تھوڑی گنجائش مل جاتی ہے وہاں اتنے قلیل تغیر کو بھی پسند نہیں کرتے' ترتیبِ قرآنی ہی کو اختیار فرماتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ ان تمام مقامات میں بھی اپنی گہری' وسیع اور باریک بین نظر سے ایسا اسلوب اختیار فرماتے ہیں کہ محاورہ کی پابندی کے ساتھ ترتیب قرآنی بھی برقرار رہے اور اگر فرق آئے تو خفیف و لطیف۔(۱۲)

شاہ صاحبؒ اکثر مواقع پر فعل' فاعل اور مفعول' جمیع متعلقات فعل' صفت و موصوف' مضاف و مضاف الیہ اور حال و تمیز وغیرہ کے حوالے سے ترتیب کی موافقت کرتے ہیں مگر ضرورت کے وقت صحیح و درست محاورے کا استعمال نہایت غور و احتیاط کے ساتھ کرنا ان کے ترجمہ کی شان سمجھی جاتی ہے۔ شاہ صاحبؒ ترتیب میں تصرف کرتے ہیں تو جچا تلا بقدرِ ضرورت نہایت غور اور احتیاط کے ساتھ۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ کا ترجمہ جیسے استعمالِ محاورات میں بے نظیر

سمجھا جاتا ہے ویسا ہی محاورات کی پابندی کے باوجود قلتِ تغیّر اور خفتِ تبدّل میں بھی بے مثال ہے۔ مثلاً ترجمہ میں کوئی مختصر لفظ بڑھا دیتے ہیں‘ جس سے مطلب واضح ہو جائے یا مرادِ خداوندی معین ہو جائے۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ ترجمہ تحت لفظی میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ کہیں کہیں بعض الفاظ کو چھوڑ بھی جاتے ہیں‘ مثلاً بعض مواقع میں اِنَّ کا ترجمہ نہیں کرتے۔ ’’یَا اَبَتِ‘‘ کے ترجمہ میں ’’اے میرے باپ‘‘ کی جگہ ’’اے باپ‘‘ اور یَا بُنَیَّ کے ترجمہ میں ’’اے میرے چھوٹے بیٹے‘‘ کی جگہ فقط ’’اے بیٹے‘‘ پر قناعت کر جاتے ہیں۔ اس قسم کے استعمال میں کوئی حرج نہیں‘ کیونکہ لفظی ترجمہ تک میں ان کی گنجائش ہے۔(۱۳)

حضرت شاہ صاحبؒ کی عام عادت یہ ہے کہ ممکنہ حد تک ترجمہ میں اُردو کے لفظ کو اختیار فرماتے ہیں۔ مثلاً ’’یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ‘‘ کے ترجمہ میں اگر ’’ایمان لاتے ہیں ساتھ غیب کے‘‘ یا ’’غیب پر‘‘ کہا جائے تو بہت صحیح اور ظاہر ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور اس میں لفظ ’’ایمان‘‘ اور ’’غیب‘‘ دونوں مشہور الفاظ ہیں۔ ان کے ترجمے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ لفظ اصطلاحِ شرع میں دو معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ایک نفس تصدیق اور یقین قلبی جو ضروریاتِ دین کے ساتھ متعلق ہو‘ جس کو حقیقتِ ایمان سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرے تصدیق اور اعمال ایمان کا مجموعہ جس کو ایمانِ کامل بھی کہتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اُصول کے موافق ضروری سمجھا کہ ترجمہ میں ایسا لفظ لائیں کہ ایمان کے جو معنیٰ اس جگہ مراد ہیں ان کی تعیین بھی ہو جائے اور دوسرا احتمال باقی نہ رہے۔ ’’غیب‘‘ کے لفظ میں اجمال ہے۔ معلوم نہیں کس چیز سے غائب ہونا مراد ہے۔ ان وجوہ سے وہ صحیح اور ظاہر ترجمہ جس کا پہلے ذکر ہو چکا‘ اس کو چھوڑ کر یہ ترجمہ اختیار فرمایا: ’’یقین کرتے ہیں بن دیکھے‘‘۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیب کے یہ معنی کہ جن چیزوں کو انہوں نے نہیں دیکھا اور ان کے علم و ادراک سے غائب ہیں‘ مثلاً دوزخ‘ بہشت‘ پُل صراط‘ وزنِ اعمال‘ عذابِ قبر‘ فرشتے‘ جِنّات‘ اس ترجمہ سے وہ بھی متعین ہو گئے‘ جیسا کہ کتبِ تفسیر میں مذکور ہے۔(۱۴)

شاہ صاحب نے اپنے ترجمے میں جن جن اُمور کا خیال رکھا ہے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اپنے مقدمے میں ان کی خصوصیات کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’......ترجمہ میں اختصار و سہولت اور الفاظِ قرآن کی لفظی اور معنوی موافقت اور صرف لغوی معنی پر بس نہیں بلکہ معنی مرادی اور غرضِ اصلی کا ہر موقع میں بہت لحاظ رکھتے ہیں اور ترجمہ میں کبھی ایسا لفظ لاتے ہیں جس کی وجہ سے اگر کسی قسم کا اجمال اور اشکال ہو تو زائل ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ فرماتے ہیں اور دوسری جگہ کچھ اور‘ حالانکہ معنیٰ لغوی اس لفظ کے ایک ہی ہیں مگر ہر مقام کے مناسب جدے جدے عنوان سے بیان فرماتے ہیں‘ جس سے قرآن کی غرض اور مراد سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی سہولت اور وضاحت کی رعایت سے کبھی مضمونِ ایجابی کو عنوانِ سلبی میں ادا کرتے ہیں اور اکثر مواقع میں نفی اور استثناء کا جدا جدا ترجمہ نہیں کرتے بلکہ حصر جو اس سے مقصود ہے‘ اس کو مختصر ہلکے لفظوں میں محاورہ کے موافق بیان کر جاتے ہیں۔ حال‘ تمیز‘ بدل وغیرہ حتیٰ کہ مفعول مطلق کے عنوانات کی رعایت رکھتے ہیں۔ اور خوبی یہ ہے کہ اُردو کے محاورہ کے موافق بالجملہ الفاظ اور معانی دونوں کے متعلق بوجوہ متعددہ بہت غور اور رعایت

سے کام لیا گیا ہے اور مطالب و مقاصد کی تسہیل اور توضیح میں پورے خوض اور احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے...... اس لیے کماً اور کیفاً دونوں طرح یہ اُمور موضح قرآن میں زائد ہیں جن کی وجہ سے ترجمہ موصوف جملہ تراجم میں ممتاز اور مفید تر نظر آتا ہے اور بنظرِ فہم و انصاف اس کا مستحق ہے کہ سہلِ ممتنع کے ساتھ ملقب ہو......''(۱۵)

ہم عصر تفسیروں میں مقام

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے شاہ صاحبؒ کی مدلّل اور جامع بحث سے استفادہ کرنے کے یہ مقاصد بتائے ہیں۔ اوّل یہ کہ اُس وقت تحت اللفظ ترجمہ کا صرف رواج ہی نہیں بلکہ علماء کا عقیدہ یہ تھا کہ قرآنی الفاظ کی ترتیب کو ترجمہ میں بھی بدلنا ایک غلط فعل ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے بڑی مہارت کے ساتھ قرآنی الفاظ کی ترتیب کو ترجمے میں معنی کے لحاظ سے کچھ اُلٹ پلٹ کیا ہے۔ اس لیے اسے پہلا بامحاورہ ترجمہ مانا جاتا ہے۔ دوسری چیز شاہ صاحبؒ کی عربی' اُردو میں پوری مہارت اور علوم قرآن میں مکمل واقفیت کا پتا چلتا ہے۔ مولانا محمود حسنؒ خود ایک ممتاز عالم دین اور مترجم قرآن ہونے کے باوجود اس ترجمے کی مدلل اور جامع طریقے سے جس انداز میں تعریف کرتے ہیں وہ بلاشبہ شاہ صاحبؒ کی عربی دانی' علوم القرآن کی شناخت' اُردو زبان پر عبور' بے پناہ علمیت اور فکر کی نزاکت کا ثبوت ہے۔

سرسید احمد خاں ''آثار الصنادید'' میں شاہ صاحبؒ کے ترجمہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''ان کا ترجمہ کلام اللہ کا' اُردو لغات کے لیے ایک بڑی سند ہے۔''(۱۶)

ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین کی کتاب ''قرآن حکیم کے اُردو تراجم'' میں مستند مترجم قرآن مولانا فتح محمد جالندھریؒ یوں فرماتے ہیں:

''اس بات پر علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ اُردو میں شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمۂ قرآن اپنے وقت کی زبان کے اعتبار سے نہایت خوش محاورہ تھا۔ اور حقیقت میں اس کے چھوٹے چھوٹے جملے' میٹھے میٹھے الفاظ' اس کی پیاری پیاری زبان ایسی ہے کہ اب بھی جو سنتا ہے سر دُھنتا ہے۔''(۱۷)

شاہ صاحبؒ نے عوام کی رعایت کو ملحوظ رکھ کر بامحاورہ ترجمہ فرمایا۔ چونکہ یہ عوام کے حال کے موافق تھا' اس لیے ان کو بہت پسند آیا' لیکن ترجمہ پھر آخر ترجمہ ہی ہے جس کو سمجھ میں آنا ہر شخص کے لیے دُشوار تھا۔ اس لیے تفسیر بھی تحریر فرمائی کہ ہر شخص جو اُردو کو اپنی استعداد کے موافق تھوڑا سمجھتا ہو وہ بھی کلامِ ربانی کے سمجھنے کے لیے اس ترجمہ سے محروم نہ رہے۔ یہ شاہ صاحبؒ کی نیت کا خلوص تھا کہ جو کچھ قسمت میں تھا اس کو لکھ کر عوام کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کے بعد یہ مذکورہ تفسیر ایسی مقبول ہوئی کہ بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے: ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

....

حوالہ جات

(۱) مولانا عبدالماجد دریابادی، تفسیر ماجدی، تاج کمپنی کراچی، اگست ۱۹۵۲ء، دیباچہ تفسیر
(۲) مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، تفسیر موضح القرآن، خورشید عالم کمپنی بالائی قلعہ علی گڑھ، ۱۳۴۶ھ، ص: ۵۱۰۔۵۱۱
(۳) مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، تفسیر موضح القرآن، حوالہ بالا، ص: ۵۵۰
(۴) مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، تفسیر موضح القرآن، حوالہ بالا، ص: ۴۹۴
(۵) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفسیر ''تفہیم القرآن''، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، ۱۹۵۸ء، ج ۴، ص: ۵۵۳
(۶) مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، تفسیر موضح القرآن، حوالہ بالا، ص: ۲۹۷
(۷) مولانا محمود حسن شیخ الہند، ترجمۂ قرآن (موضح الفرقان)، شاہ فہد پرنٹنگ کمپلیکس، مدینہ منورہ، سعودی عرب، ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء، ص: ۵
(۸) مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، تفسیر موضح القرآن، حوالہ بالا، ص: ۹۸
(۹) نفس مصدر، ص: ۴۸۷
(۱۰) مولانا محمود حسن شیخ الہند، ترجمہ قرآن (موضح الفرقان)، حوالہ بالا، ص:: ۲
(۱۱) نفس مصدر، ص: ۲ (۱۲) نفس مصدر، ص: ۳
(۱۳) مولانا محمود حسن شیخ الہند، ترجمہ قرآن (موضح الفرقان)، حوالہ بالا، ص: ۴
(۱۴) نفس مصدر، ص: ۴، ۵ (۱۵) نفس مصدر، ص: ۴
(۱۶) سرسید احمد خاں، آثار الصنادید، سنٹرل بک ڈپو، اُردو بازار، جامع مسجد دہلی، ۱۹۶۵ء، ص: ۳۶۲
(۱۷) ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اُردو تراجم، مکتبہ شرف الدین ممبئی، ۱۹۸۴ء/ ۱۴۰۴ھ، ص: ۱۹۰

❁❁❁

بقیہ: مِلاکُ التأوِیل

حاشیہ

(۱) زمخشری نے اس کے بعد یہ فقرہ درج کیا ہے:

''اگر تم یہ کہو کہ یوں کیوں نہ کہا گیا: انَّا منْهُ مُنْتَقِمُوْنَ : ''ہم اُس سے انتقام لینے والے ہیں'' تو میں جواباً کہوں گا کہ جب اللہ نے ایسے شخص کو ظالموں میں سب سے بڑھ کر ظالم قرار دیا ہے اور پھر عمومی طور پر تمام مجرموں سے انتقام لینے کی وعید سنائی ہے تو پھر معلوم ہو گیا کہ جو سب سے زیادہ ظالم ہے، اسے انتقام میں سے زیادہ حصہ بھی ملے گا، لیکن اگر خاص طور پر یہ ضمیر لا کر اس کا ذکر کیا جاتا تو یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔''

صاحبِ ''ملاک التاویل'' نے اس بات کو اس کا مسلک خبیث قرار دیا ہے، غالباً اس کا اشارہ معتزلہ کے اس اصول کی طرف ہے کہ اللہ نے جو وعدہ اور وعید دیا ہے، اس کا کرنا اس پر واجب ہے، تو پھر جب اس شخص کو ظالموں میں سب سے بڑا ظالم قرار دیا گیا تو اسے جزا وسزا کا خصوصی مستحق قرار دیا جانا چاہیے تھا۔ اور چونکہ اس کا خصوصی ذکر نہیں ہوا تو زمخشری کو مذکورہ تاویل کرنی پڑی۔ واللہ اعلم! (اضافہ از مترجم) ❁❁❁

عقیدہ سے ہم آہنگ نظریہ سازی اور علم الکلام

مکرم محمود

ہمارے ہاں جدید فکری‘ نظری اور کلامی مباحث کے حلقوں میں ایک عام غلط فہمی اور سادہ فکری پائی جاتی ہے کہ ”عقیدہ سے ہم آہنگ نظریہ سازی“ اور ”علم الکلام“ ایک ہی چیز ہے۔ دراصل عقیدہ سے ہم آہنگ نظریہ سازی سے مراد یہ ہے کہ وہ عقائد جن کو ہم الحق ”مانتے“ ہیں ان کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق‘ ان سے ہم آہنگ نظریہ سازی مختلف علوم میں کی جائے۔ یعنی شعورِ عقیدہ کو قبول کر کے جو نظری اور عملی علم تخلیق کرے گا اور اپنے تسلیم شدہ عقائد کی تقویت‘ دفاع اور اظہار کے لیے کارآمد بنائے گا تو یہ عمل نظریہ سازی کہلائے گا۔ نظریہ سازی کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے‘ جسے جدید علم الکلام بھی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ متکلمین نے یہی کام اپنے زمانے کے مزاجِ علم اور حدودِ علم کو سامنے رکھتے ہوئے کیا تھا۔ درحقیقت یہ محض ایک خلط منہج و مبحث ہے۔ علمِ کلام کی روایتی تعریفات کو سامنے رکھا جائے تو علم الکلام کا اس نظریہ سازی کے منہج سے اصلاً کوئی تعلق نہیں ہے‘ ہاں ضمناً بعض فروعات میں کچھ مشابہتیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ علم الکلام کے ذریعے اثبات و دفاعِ عقائد اور دفعِ شبہات کے لیے قطعی دلائل قائم کرنے کی قدرت پیدا ہوتی ہے۔ اس پورے طریقہ کار میں کچھ معیارات طے شدہ ہیں۔ قطعی دلائل سے کیا مراد ہے‘ یہ بھی طے ہے۔ اس کا مطلب اختلافات کا مکمل خاتمہ نہیں ہے۔ اختلاف یقیناً ہوتا ہے اور جدلیاتی طریقے سے بحث آگے بڑھتی ہے لیکن عام طور پر ان اختلافات کا منبع اصول و معیارات کے حوالے سے نہیں ہوتا‘ کیونکہ اکثر اصول و معیارات بدیہیات سے جنم لیتے ہیں‘ اور جو بدیہیات کا انکار کرتا ہے وہ سوفسطائی ہے اور لائقِ مکالمہ ہی نہیں۔ ہاں یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات آپ کے مدعا میں یا جس مسئلے پر آپ دلیل قائم کر رہے ہیں اس میں اور بدیہی مقدمات جو بنائے استدلال ہوتے ہیں‘ کے درمیان میں بہت سے وسطی یا توسیطی قضایا ہوتے ہیں اور ہر قضیہ دوسرے قضیہ سے لزومی یا قطعی استدلالی تعلق رکھتا ہے یہاں تک کہ بات اپنی اصل یعنی بدیہیات پر جا کر رکتی ہے۔ ان درمیانی قضایا اور ان کے تعلق میں کثرت کے باعث پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے اختلاف جنم لیتا ہے‘ مگر یہ بدیہیات پر نہیں ہوتا بلکہ صرف ان قضایا کے ان بدیہیات سے تعلق کے ثبوت اور عدمِ ثبوت پر ہوتا ہے۔ اس اختلاف اور بدیہیات کے انکار سے پیدا ہونے والے اختلاف میں امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے۔ کسی شبہ کے رد میں یا کسی اور ضرورت کے تحت کسی مسئلے کو حل کرتے وقت علم الکلام میں قطعی دلائل کی بنیاد پر جو جواب دیا جاتا ہے وہی تحقیقی کہلاتا ہے۔ الزامی جواب بھی ہوتا ہے جس میں مخاطب کے مقدمات پر سوال اٹھائے بغیر اسے تسلیم کر کے کوئی بات کی جاتی ہے مگر یہ جواب ضرورت کے تحت

ہوتا ہے اور اس پر مکمل انحصار نہیں کیا جاتا۔ اقناعی (مقدمات یقینی اور برہانی نہ ہونے کے باوجود مخاطب میں یقین کی کیفیات پیدا کرنے والے)، خطابی (جوشِ خطابت اور بیان کی صلاحیت کی بنیاد پر متاثر کرنے والے) یا جذباتی (جذبات و عاطفہ کو مخاطب بنانے والے) دلائل اصلاً روایتی علم الکلام کا موضوع نہیں ہیں، ہاں ضمنی طور پر کچھ وجوہات کی بنیاد پر ہو سکتے ہیں کیونکہ ان کا انضباط (منضبط ہونا) اور اصول و معیارات سے لزومی تعلق دکھانا ممکن نہیں ہے۔

جہاں تک نظریہ سازی کا منہج ہے تو یہ اپنی ساخت اور نہاد میں مابعد روشن خیالی جدید مغربی فلسفیانہ روایت کا پروردہ و زائدہ ہے۔ ہر فلسفی اور نظریہ ساز اپنے عقائد سے ہم آہنگ نظریہ سازی اپنے تئیں کر رہا ہے لیکن اس کے کوئی متفقہ اصول و مبادی نہیں ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اساسات اور معیارات ہیں۔ یہ دراصل اظہارِ ذات ہے۔ جیسا کہ ایک تعریف فلسفہ کی یہ بھی کی جاتی ہے کہ فلسفہ اظہارِ ذات کا نام ہے جس کے ذریعے ایک فلسفی اپنی انفرادیت قائم اور ظاہر کرتا ہے جس میں تعقل، تخیل اور خواہشِ تفرد سب کا ایک آمیزہ ہوتا ہے۔

کلامی اور جدید نظریہ سازی کے منہج میں اختلاف بنیادی اور اساسی ہے۔ ان کو ایک سمجھنا دونوں مناہج کی عدم تفہیم پر دلالت کرتا ہے۔ ایک قطعیت اساس اور یقین مرکز ہے جبکہ دوسرا ظن اساس اور تشکیک مرکز ہے۔ عقیدہ سے ہم آہنگ نظریہ سازی ایک بے قاعدہ اور بے اصول چال ہے جس کے اصول و ضوابط مرتّب و منظّم نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ یہ چال اکثر اوقات عقائد ہی کی خرابی پر منتج ہوتی ہے جبکہ علم الکلام میں باقاعدہ اور بااصول طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ اپنے زمانے کے نظریات سے استفادہ کی بات بھی علم الکلام کے حوالے سے مکمل طور پر درست نہیں ہے۔ جن چیزوں کو اس علم میں بنائے استدلال بنایا گیا وہ قواطع عقلیہ تھے جن کی قطعیت اس وقت بھی ثابت تھی اور اِس وقت بھی ثابت ہے۔ سوفسطائیت کی بات الگ ہے چاہے وہ جدید ہو یا قدیم (سوفسطائیت جدیدہ نے عقل کا چولا پہن رکھا ہے اور اپنی پشت پر تہذیبی طاقت رکھتی ہے)۔ یہاں یہ بات نہیں کی جارہی کہ روایتی علم الکلام اس زمانے سے متعلق ہے یا غیر متعلق۔ بس دو مناہج میں مابہ الامتیاز بیان کیا جارہا ہے اور یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ جدید نظریہ سازی کا منہج علم الکلام کا تسلسل نہیں ہے چاہے وہ اپنے زمانے سے متعلق ہو۔ زمانے سے متعلق ہونا صحت کی دلیل نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جدید مغرب میں فلسفہ اور سوشل سائنسز میں جو مستقل نظریہ سازی کی جارہی ہے اس کا ہمارے پاس متبادل کیا ہے؟ تحقیقی جواب تو یہی ہے کہ کوئی متبادل نہیں ہے۔ یہ ساری سرگرمی ہمارے مزاجِ علم اور مقصدِ علم سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اور الزامی جواب یہ ہے کہ متبادل پیش کرنے اور اس طرح کی نظریہ سازی کی جس نے بھی کوشش کی اہلسنت والجماعت کے عقیدے پر اس نے ضرور ہاتھ صاف کیا ہے۔ (اگر کوئی متبادل نظریہ سازی کا کوئی طریقہ کار وضع کرتا ہے جس سے عقیدہ اور اس سے متعلق ہمارے روایتی علوم کے ثوابت پر کوئی ضرر نہیں آتا تو پھر دیکھا جائے گا کہ کیا واقعی ایسا ہے۔ اگر ہے تو پھر اصولاً کوئی حرج نہیں۔ لیکن ہماری ناقص رائے میں عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے) ہم عصر اسلوب و زبان میں اپنی بات

کرنا یقیناً مفید ہے لیکن یہ طریقہ اس نظریہ سازی کی سرگرمی سے اپنے امتیازات نہایت واضح رکھتا ہے۔

علم الکلام اور نظریہ سازی کے منہج میں امتیاز نہ کرنے کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ علم الکلام پر قیاس کرنے کی وجہ سے منہجِ نظریہ سازی کی توجیہہ کر لی جاتی ہے اور مفاسد سے صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار کو روایتی کہہ دیا جاتا ہے اور اس کی اساس اپنی کلامی روایت میں تلاش کی جاتی ہے حالانکہ یہ کامل طور پر جدیدیت سے مستعار منہج ہے۔ کسی ضرورت سے کچھ اصطلاحات کا استعمال اور بات ہے اور ایک پورے منہج کو باہر سے مستعار لینا بالکل دوسری بات۔ پھر یہ کہ اس منہج کے حاصلات کا ظنی ہونا چونکہ ظاہر و باہر ہوتا ہے اس لیے اس پر قیاس کرتے ہوئے علم الکلام کی چند قطعیات کو بھی ظنی قرار دے دیا جاتا ہے۔ وہ قطعیات جو درحقیقت اصول ہیں ان کو ظنی قرار دینے کا مطلب اس علم کی پوری عمارت کو گرا دینا ہے۔ ہر وہ نظری اور عقلی سرگرمی جس کی بنا ہمارے ان روایتی علوم کے انہدام پر ہو جو دین کے ساتھ کچھ ضروری نسبتیں رکھتے ہیں، مشکوک ہے۔ یہ ماقبل کوئی حکم صادر نہیں کیا جا رہا بلکہ ان تمام سرگرمیوں کے تحلیل و تجزیہ کے بعد یہی بات سامنے آتی ہے۔

ایک دوسرے تصور کو علم الکلام ایک حیثیت سے کہا جا سکتا ہے کہ جس میں جدید نظریات کی داخلی عدم ہم آہنگی کو بیان کیا جائے اور ان نظریات کے مفروضہ و مزعومہ مقاصد و نتائج اور بالفعل حاصلات و عواقب میں دوئی کو ظاہر کیا جائے۔ اس کو الزامی علم الکلام قرار دیا جا سکتا ہے۔ امام غزالیؒ کی ''تہافت الفلاسفہ'' میں اس طریقہ کار کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ امام صاحب کے ہاں فلاسفہ کے نظریات پر اپنے اصول و قواعد کی روشنی میں بھی تنقید ہے (تحقیقی طریقہ کار) اور ان کے داخلی تضادات کو بھی ظاہر کیا گیا ہے (الزامی طریقہ کار)۔ یہ واضح رہے کہ اس تصور کو نظریہ سازی کے منہج سے خلط نہیں کرنا چاہیے۔

مسئلہ یہ ہے کہ آج کل تحریری یا تقریری مکالمہ میں ایک صاحب اپنے عقائد سے ہم آہنگ تصورات و نظریات پیش کر رہے ہوتے ہیں اور دوسرے صاحب اپنے عقائد سے مطابقت رکھنے والی فلسفیانہ تشکیلات اور نظریاتی ڈھانچے قائم فرما رہے ہوتے ہیں اور مکالمہ بھی ہو رہا ہے اور یہی متعین نہیں ہے کہ وہ بنیادی مشترک میدان کون سا ہے اور کہاں ہے جہاں پر یہ کشتی لڑی جائے گی۔ کوئی بنیادی مقدمات ہی طے نہیں ہیں، نہ بدیہی مقدمات کو بنائے استدلال بنانے کی بات کی جا رہی ہے۔ ان میں سے اکثر ایک سوفسطائی ہوتا ہے مگر المیہ یہ ہے کہ دوسرے کو اس بات کا علم ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہ بھی اپنے پورے استدلال کی تعمیر اس طرز پر کر ہی نہیں رہا کہ مدِمقابل کے انکار کے نتیجے میں اسے اس کے سوفسطائی ہونے کا علم ہو۔ اس طرح کے مکالموں میں فیصلہ کن چیز ان تصورات و نظریات کے پیچھے موجود تہذیبی طاقت ہے، ان کی حاضر و موجود تصوّرِحیات کے ساتھ کامل مطابقت ہے یا ان تصورات و نظریات کی افادیت ہے۔ علم و عقل کی قطعیات عصرِ حاضر میں بالفعل تو کبھی فیصلہ کن نہیں ہوتیں اور نظری طور پر ان کی اس حیثیت کو سوفسطائیانہ فلسفیانہ تشکیلات اور مابعد جدید تصور سازی نے ویسے بھی مجروح کر دیا ہے۔

جدید نظریہ سازی کے منہج والے سمجھتے ہیں کہ اس طرح اپنے عقائد کی بنیاد پر جدید نظریہ سازی کر کے یا ایک

نیا نظری علم پیدا کر کے وہ وہی کام کریں گے جو اپنے زمانے میں اشعریؒ' باقلانیؒ' غزالیؒ اور رازیؒ نے کیا تھا' حالانکہ یہ محض خوش فہمی ہے۔ اس طریقہ کار کو اختیار کر کے آپ حق کے لیے کیے جانے والے استدلال کو قطعی سے ظنی بنا دیں گے کہ پھر حق کا تعین قوت' افادیت' خوبصورتی وغیرہ سے ہو رہا ہو گا نہ کہ حقیقت نفس الامری سے مطابقت کی بنیاد پر۔ ویسے بھی اس موقف کے حاملین اکثر عقیدہ کو بس ایک مان لینے کی چیز سمجھتے ہیں اور علم و عقیدہ کی قطعی دوئی کے قائل ہیں۔ یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید نظریہ سازی کا منہج پوری کلامی روایت سے ایک نسبتِ تضاد رکھتا ہے اور ان کو ایک سمجھنا سادہ فکری اور دونوں مواقف کی ماہیت سے عدم واقفیت پر دلیل ہے۔

اس پورے مبحث کو ایک اور زاویہ نگاہ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور وہ زاویہ نظر چونکہ نظریہ سازی والے منہج کو نسبتاً کچھ مضبوط بنیادیں فراہم کر سکتا ہے تو بہتر ہے کہ اس کی توضیح و تنقیح بھی کر لی جائے۔ وہ یہ ہے کہ اس پوری بحث کو حکمتِ عملی اور حکمتِ نظری کی ہماری روایت میں کی جانے والی تفریق کے تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے۔ حکمتِ نظری میں الٰہیات' طبیعیات' ریاضیات زیرِ بحث آتی ہیں۔ ان کا تعلق انسانی ارادہ و عمل سے نہیں ہے یعنی ان میں جن حقائق کو نظری طور پر زیرِ بحث لایا جاتا ہے وہ انسانی اختیار کے تابع نہیں ہیں جبکہ حکمتِ عملی میں تہذیبِ اخلاق' تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدن زیرِ غور آتے ہیں۔ ان میں وہ حقائق اور عملی تدابیر زیرِ بحث آتی ہیں جو انسانی ارادہ و اختیار کے تابع ہیں۔ یعنی حکمتِ عملی میں مقصود عمل اور عملی مسائل ہیں جبکہ حکمتِ نظری میں مقصود عقیدہ' فکر اور نظری مسائل ہیں۔ یہاں اس تقسیم کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اس پورے مبحث کو اس طرح بیان کیا جائے اور اس کا استناد حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی صاحبؒ سے کیا جائے کہ جس طرح ان کے ہاں ہمیں ایک توجہ اور تاکید کے مرکز کی تبدیلی (shift of emphasis) نظر آتی ہے یعنی حکمتِ نظری سے حکمتِ عملی کی طرف (جو ان کے نظریہ ارتفاقات میں ظاہر ہے۔ شاہ صاحب کو ایک عمرانی مفکّر بھی کہا جاتا ہے) تو اس کی یہی توجیہہ بیان کی جاتی ہے کہ شاہ صاحبؒ اپنے عہد میں ماحول کی تبدیلی کو بھانپ گئے تھے اور ان کو احساس ہو گیا تھا کہ اب حکمتِ نظری کے بجائے حکمتِ عملی کی زیادہ حاجت ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ اس معاملے میں شاہ صاحب سے استناد پکڑنے والی یہ بات درست ہے اور اپنا جواز رکھتی ہے' مگر اس کے حوالے سے عرض یہ ہے کہ یہاں جو توجہ اور ترکیز کی تبدیلی ہمیں نظر آتی ہے وہ حکمتِ نظری کو مکمل نظر انداز کر کے نہیں تھی۔ مراد یہ ہے کہ حکمتِ نظری اپنی اصولی اور اساسی حیثیت میں موجود تھی۔ ضمناً اور تبعاً حکمتِ عملی کو کچھ زمانے کی ضرورتوں کے ادراک کی بنا پر زیادہ اہمیت دی گئی مگر حکمتِ نظری کو اس کے مقام سے دیس نکالا نہیں دیا گیا اور نہ ہی ان دونوں میں کوئی باہم مخاصمت و تضاد کی نسبت تھی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ شاہ صاحب کا یہ کام ان کے اور بہت سے کاموں کے بیچ میں ایک کام تھا نہ کہ ان کا کل کام' اور یہ بات بھی اہم ہے کہ شاہ صاحب اس میں متفرد تھے۔ یعنی باقی علماء و حکماء کے ہاں ہمیں یہ تحول مشاہدَ نہیں ہوتا۔ شاہ صاحب کے اس طرزِ عمل سے اگر کوئی استدلال کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا کہ شاہ صاحب کے ہاں یہ ان کے بہت سے کاموں کے ساتھ اور ان سے مربوط ایک کام ہے اور

حکمتِ نظری میں اپنی اساس اور جڑیں رکھتا ہے۔ اس لیے اس کو ان کے پورے نظامِ فکر سے الگ کر کے بنائے استدلال بنانا کوئی جواز نہیں رکھتا۔[1] اگر یہ کہا جائے کہ حرج ہی کیا ہے کہ اس جدید طرز پر نظریہ سازی کی جائے اور ایک نیا نظری علم پیدا کیا جائے اور دین کو اپنے زمانے سے متعلق رکھا جائے تو اس حوالے سے عرض ہے کہ اگر یہ 'حکمتِ عملی' اپنی اساس روایتی نظری علوم میں رکھتی ہو اور ان کا انکار یا کل کو بجائے ثوابت اور متغیرات میں تقسیم کرنے کے متغیر کے خانے میں ڈال دینا یعنی ان کو اپنے زمانے تک محدود کر دینا جیسے موقف اور ان سے مخاصمانہ تعلق اگر نہ رکھتی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔ لیکن عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ جو بھی نئے نظری علم یا جدید نظریہ سازی یا نئے علمِ کلام کی بات کرتا ہے وہ پچھلے علوم کے انکار یا ان کو عہدِ جدید میں بیکار کہنے سے ہی بات کا آغاز کرتا ہے۔ اگر ان کو اس پر تنبیہہ کی جائے تو ان میں سے بعض حضرات ائمہ متکلمین رازیؒ وغزالیؒ کی تعریف شروع کر دیتے ہیں کہ اپنے دور میں کیا ہی عمدہ کام کیا تھا' مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ یہی حضرات کچھ اصولوں کو قطعی ارشاد فرما رہے ہوتے ہیں اور آپ کا پورا پراجیکٹ ہی ان کو ظنی قرار دینے سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی طرف سے جواب میں اگر یہ کہا جائے جن اساسات کی بنیاد پر آپ قطعیت کی بات کرتے ہیں ان اساسات مثلاً عقل کی تعریف ہی اب بدل گئی ہے۔ ہم ان اساسات کے تو قطعی ہونے کے قائل ہیں مگر اب انہی الفاظ و اصطلاحات کو چونکہ بالکل جدید معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اس لیے ہم جو بات کرتے ہیں وہ ان اصطلاحات کے جدید معانی کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اس بارے عرض ہے کہ اگر یہ تفریق آپ پر خود واضح ہو' آپ اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا

(۱) یہ اور بات ہے کہ جدید نظریہ سازی کے منہج کے بعض حاملین شاہ صاحبؒ کے اس طرزِ عمل میں ان کے شدید مخالف ہیں اور اس کے درست نہج پر نہ ہونے کے قائل ہیں۔ اس وجہ سے ان کے خیال میں ہمیں ضرورت ایک نئے نظری علم کی ہے نہ کہ صرف ایک نئی 'حکمتِ عملی' کی۔ شاہ صاحب سے اس معاملہ میں استناد پکڑنے والا گروہ وہ ہے جو حکمتِ عملی پر پوری توجہ مرکوز کرنے کا قائل ہے نہ کہ ایک نئے نظری علم کی پیدائش کی ضرورت کا۔ کچھ لوگ ان دو آراء کے بیچ میں کہیں اپنی رائے رکھتے ہیں (وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا) یہاں ان سب گروہوں کو الگ الگ شناخت کروانا مقصود نہیں ہے بلکہ اتنا جان لیجیے کہ ان سب کے ہاں حکمتِ نظری میں الٰہیات اور اس پر وارد ہونے والے اعتراضات اور شبہات کو موضوع بنانے والا علم الکلام جو اپنی اساسات قواطعِ عقلیہ میں رکھتا ہے' ثوابت و متغیرات کی تقسیم سے قطع نظر کُل کا کُل اپنے زمانے کی ضرورتوں سے پیدا ہونے والا علم تھا' اور جدید نظریہ سازی کے منہج کے حاملین کا بھی بعینہٖ یہی موقف ہے۔ یعنی علم الکلام بھی ایک طرح کی نظریہ سازی ہی تھی۔ اس تحریر میں اس پر اعتراض مقصود ہے۔ جہاں اصول متعین ہوں وہاں بھی اصل وفرع کے تعلق میں اختلاف کی بنیاد پر کئی مکاتبِ فکر وجود میں آ جاتے ہیں اور جہاں اصول ہی طے نہ ہوں وہاں نظریات وتصورات کے طوفان کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ ہماری عرفانی یا نظری تصوف کی روایت میں نظریہ سازی کی گئی ہے مگر اس کا محل' اساس اور غایت بالکل جدا اور ممتاز ہے۔ وہاں نظریہ سازی اگر کی بھی گئی ہے تو اس عالم سے ورے عالم کی کی گئی ہے نہ کہ اس عالم کی۔ اسی طرح حادث وقدیم کے مابین تعلق کی کی گئی ہے نہ کہ حوادثات کے درمیان تعلقات کی۔ کیونکہ وہ سارا علم ناسوت مرکز نہیں لاہوت مرکز تھا' انسان مرکز نہیں خدا مرکز تھا۔

کریں اور مخاطبین کو بھی آپ کی اس تفریق کا علم ہو تو پھر کوئی مسئلہ نہیں مگر یہ تفریق تو آپ نے اعتراض کے جواب میں واضح کی ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ آپ اکثر اپنے موقف کو اس طریقے سے بیان کرتے ہیں کہ اس تفریق کی گنجائش ہی نہیں ہوتی' مگر اعتراض کے جواب میں آپ یہ بیان بھی کر دیتے ہیں' حالانکہ اس تفریق کو آپ کے الفاظ قبول ہی نہیں کر رہے ہوتے۔ یہ ایک تضاد کی سی صورت ہے اور ہماری جدید علمی صورتحال کا المیہ یہ ہے کہ تضادات کو تنوعات اور کلام کی خوب صورتی سمجھا جاتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اس پورے پراجیکٹ یا حکمتِ عملی کو ان شرائط کے ساتھ مشروط قرار نہ دے کر اگر عمل میں لایا جائے گا تو دین کی اساس [اساس سے مراد یہ لی جارہی ہے کہ انسانی فطرت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اجمالی معرفت بالفعل یا بِالقُوّۃ موجود ہے۔ یعنی اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ اس معرفت کو قطعی دلائل کے ذریعے حاصل کر سکے اور مخاطب کے لیے بھی معروضی (نہ کہ حسّی) بنیادوں پر ان کو ثابت کر سکے اور نبی کی نبوت کو معجزے کے ذریعے پہچان سکے] بھی ظنیات پر قائم قرار دے دی جائے گی۔ ہمارے روایتی عقلی ونظری علوم پر سے اعتبار اُٹھ جائے گا۔ جدید نظریہ سازی کی بات کرنے والے عام طور پر دینی علوم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ان کو اکثر اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کے اس عمل کی زد کون کون سے دینی عقائد اور علوم پر پڑتی ہے۔ علم اور علماء پر سے اعتقاد اٹھ جاتا ہے بلکہ ان کو جاہل سمجھنے کا رویہ پروان چڑھتا ہے۔ ہدایت اور علم میں یا ایمان اور علم میں ایک قطعی تفریق قائم ہو جاتی ہے۔ علم کو صرف سکہ رائج الوقت قرار دے دیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کے پاس یہ نہ ہو چاہے ایمان اور ہدایت سے وہ کتنا ہی مالا مال کیوں نہ ہو' اس تعریف کے مطابق ہوگا تو وہ جاہل ہی ہے۔

ایک وضاحت یہاں پر ہو جائے تو مناسب ہے کہ اگر نئے نظری علم سے صرف یہ مراد لی جائے کہ اپنے زمانے کو سمجھنے کے لیے ہمیں کچھ نئی اصطلاحات سے واقفیت بہم پہنچانے کی ضرورت ہے اور اغیار کی لکھی ہوئی کتابوں سے استفادہ کی حاجت ہے' اپنے زمانے کو سمجھنے کے لیے نہ کہ ہدایت کے فہم کے لیے' تو پھر یقیناً یہ ایک بالکل الگ بات ہے اور اس کی نہ صرف گنجائش ہے بلکہ خاص مواقع پر بعض اصحابِ علم کے لیے کچھ شرائط کے ساتھ وجوب بھی رکھتی ہے۔ اس بات کو اس موقف' جو پیچھے بیان کیا گیا ہے اور جس پر تنقید کی گئی ہے' کے ساتھ خلط نہ کیا جائے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ جب اس طرح کے عمومی فکری رجحانات پر بات ہو رہی ہوتی ہے اور ان پر کچھ خاص وجوہات سے تنقید کی جارہی ہوتی ہے تو ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان فکری رجحانات سے بظاہر ہم آہنگ تمام افکار اور ان کے تمام حاملین بھی اس کی زد میں آ گئے۔ متعین حکم لگانے کے لیے تفصیل میں جانا پڑتا ہے اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اپنی فکر کے لوازمات کا ان کو علم بھی ہے کہ نہیں! اگر علم ہے تو کیا وہ اپنی فکر کو اپنے تئیں کچھ اس طریقہ سے پیش کرتے ہیں کہ وہ لوازمات اس تبدیلی کی وجہ سے لازم نہ آئیں؟ اگر ان کو لوازمات کا علم ہے مگر پھر بھی اس کو پوری طرح قبول کرتے ہیں تب ہی وہ اس فکری رجحان کے صحیح نمائندے ہیں اور ان پر وہ تمام تنقیدات صادق

آئیں گی۔ پھر لوازمات و نتائج میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بعض حضرات کو لوازمات کا علم تو ہوتا ہے' نتائج کا نہیں۔ لوازمات کو جاننے کے لیے عقل کی ذرا سی حرکت ہی کافی ہوتی ہے جبکہ نتائج کے لیے غور و فکر کی حاجت ہوتی ہے۔ مثلاً جدید نظریہ سازی کے منہج کے حوالے سے جو بات کی گئی اس میں ہم نے دین کا قطعی اساسات پر نہ رہنے کا ذکر بھی کیا۔ اب یہ نتیجہ ہے نہ کہ لازمہ' یا لازم تو ہے لیکن اس کا لزوم پوشیدہ ہے' کیونکہ اس منہج کے حاملین کے ہاں قطعیت کا مطلب ہی واضح نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں اگر عقیدہ انسانی نفس میں اپنے قطعی بنیادیں ایمان و یقین کی صورت میں رکھتا ہو' بس یہی قطعیت ہے اور دین قطعی اساسات پر ہی استوار ہے اور پتا نہیں کس قطعیت کی بات کی جارہی ہے۔ یہ ہم واضح کر آئے ہیں کہ ہم تو قطعی اساسات سے مراد معروضی قطعی اساسات لے رہے ہیں یعنی بدیہیات یا قواطعِ عقلیہ' یہ الگ مسئلہ ہے کہ معروضی قطعی اساسات کا مطلب اور اہمیت سمجھانا بھی اب خاصا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ گویا یہ مبحث ایک زمانے میں بدیہی تھا' اب نظری ہو گیا ہے (بدیہی self evident ہوتا ہے جس کے لیے قوتِ نظریہ کے استعمال کی یا غور و فکر کی حاجت نہ ہو جبکہ نظری میں غور و فکر اور نظری قوتوں کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے)۔ لوازمات بدیہی ہوتے ہیں اور نتائج اگر سامنے نہ آ گئے ہوں تو نظری۔ اس کو ہم نظریہ سازی کے منہج کا لازمہ کے بجائے نتیجہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اس کو جاننے کے لیے کم از کم اب غور و فکر کی حاجت ہے۔ لزوم تو یہاں بھی ہے مگر جدید ذہن کے لیے ذرا مخفی ہے اس لیے اسے نتیجہ کہہ دیا گیا ہے۔

پھر اس نظریہ سازی کے نتیجے میں جو مطلوب نتائج حاصل کرنے کی خواہش کی جارہی ہے وہ صرف اس کے نتیجے میں حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ یعنی اسلام کی حقانیت اور علمی برتری ثابت کی جا سکے' یا عصرِ حاضر سے اسلام کی مطابقت پیدا کی جا سکے۔ مغرب میں نظریہ سازی کا عمل آزادی کی قدر پر استوار ہے اور اپنے پیچھے تہذیبی اور ٹیکنالوجیکل طاقت رکھتا ہے تو اس سے اس میدان میں مقابلہ کرنا اور اسے پچھاڑنے کے خواب دیکھنا سفاہت ہے۔ جس طرح مغرب سے ریس لگا کر اس سے زیادہ طاقت حاصل کر کے اسے پچھاڑنے کا پورا عمل انسانی نفس' اس کے احوال اور معاشرہ کی تشکیلِ نو کے بغیر ممکن نہیں ہے جس کے نتیجے میں دین کے مطلوب انفسی احوال' اعمالِ صالحہ اور خیر پر استوار معاشرت کا امکان بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے' اسی طرح جدید نظریہ سازی کے منہج والوں کا عقیدہ کامل طور پر درست رہ جانا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ علم الکلام نے اپنے عہد میں وہ کام کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ تحدی (challenge) الٰہیات کے باب میں تھی' اب تحدی عملیات سے متعلق ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت ہمیں اس طرح کی 'تحدیات' کا ادراک اسلاف و اکابر کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ ایک عملی یا علمی ضرورت پیدا ہوتی تھی' علماء میں سے کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس حاجت کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرما دیتا تھا۔ یہ سلسلہ آگے چلتا تھا' اور بھی بہت سے اصحابِ علم اس سے متعلق ہو جاتے تھے تو ایک پورا علم وجود میں آ جاتا تھا۔ باطل فرقوں کے ساتھ کلامی مباحث جدلیاتی طریقے سے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ پہلے سے کوئی پورا پراجیکٹ بنا کر کام کرنے کا طریقہ کار نہیں تھا کہ

ہمیں فلاں فلاں تحدیات درپیش ہیں اور ہمیں نئے نظری علوم پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ اپنے زمانے کے عقلی علوم سے استفادہ کیا گیا تھا‘ مگر وہ استفادہ غالب کا مغلوب سے تھا اور عقائد میں جو شبہات پیدا کیے جا رہے تھے ان کو دور کرنے کے لیے تھا‘ نہ کہ ان سے استفادہ کی بنیاد پر عقائد میں کسی تبدیلی کو گوارا کیا جاتا۔ عقیدہ کی اہمیت سب سے فائق اور مقدم تھی اس لیے اس معاملے میں کسی کمزوری اور سستی کو برداشت نہیں کیا گیا۔ عقائد پر اعتراضات کے جوابات میں جو کچھ تفصیلات جنم لیتی ہیں ان میں کچھ ایسی اصطلاحات بھی استعمال کی گئیں جو بظاہر قرآن وسنت سے ماخوذ نہیں تھیں مگر ان سب کا مقصد یا تو دنیا کی تفہیم تھا یا اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے متعلق کچھ ناروا باتوں کی نفی۔ یعنی الٰہیات کے باب میں عقیدہ کو تنزیہ پر قائم رکھنا اور تشبیہی رجحانات کی بیخ کنی کرنا۔ یہ بات مسلّم ہے کہ ’نفی‘ یا ’نہیں‘ تو اجمالی ہوتی ہے لیکن اس میں جب کچھ وجوہات سے تفصیل کی حاجت ہوتی ہے تو اس ’نہیں‘ یا ’نفی‘ کے ساتھ سوابق کی حاجت ہوتی ہے (مثلاً جوہر نہیں ہے‘ عرض نہیں ہے‘ وغیرہ وغیرہ)۔ ان اصطلاحات پر اعتراض کرنے والے شاید اس بات کو نہیں سمجھ پائے۔ یہ ایک ضمنی بات تھی‘ مناسب لگا کہ اس کا بھی ذکر ہو جائے۔ باقی اگر یہ مان لیا جائے کہ تحدی اب عملیات سے متعلق ہے تو یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سے نمٹتے ہوئے عقائد پر ہاتھ صاف نہ کیا جائے اور وہ حکمتِ عملی اپنی اساس عقائد اور کچھ اصول وضوابط میں رکھتی ہو۔ بے قید نظریہ سازی نہ اپنی علمی اساس رکھتی ہے نہ اپنے نتائج میں انسان کو بندگی کے قابل چھوڑتی ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ اس تحریر میں بنیادی طور پر تو علم الکلام کی اساس وغایت اور جدید نظریہ سازی کے منہج کے درمیان مابہ الامتیاز کے تعین ہی کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ اگر واضح ہو جائے تو بہت سی اٹھتی آوازوں کی حقیقت سامنے آ جائے گی۔ باقی روایتی علم الکلام عہد حاضر میں متعلق ہے یا نہیں‘ یا اگر نظریہ سازی کا منہج اپنی مندرجہ بالا تفصیلات وتحدیدات کے ساتھ درست نہیں ہے تو پھر کیا کیا جائے‘ یہ اصلاً ہمارا موضوع نہیں تھا۔ ہاں کچھ باتیں ضمنی طور پر آ گئی ہیں جو اگرچہ ناکافی ہیں لیکن شاید مفید ہوں۔ مقصود کے طور پر جدید نظریہ سازی کے منہج میں جو مسائل ہیں ان کی طرف کچھ اشارے کیے گئے ہیں‘ جو ان شاء اللہ ان دو مناہج کے درمیان پائے جانے والے امتیاز کو نمایاں کرنے میں کارآمد ہوں گے۔ ❁❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعتِ خاص: 200 روپے　اشاعتِ عام: 75 روپے

مباحثِ عقیدہ (۱۷)

مؤمن محمود

دورِ صحابہؓ میں عقیدہ کے حوالے سے دو بڑی گمراہیاں

پچھلے درس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم انسانی علم کی مانند نہیں ہے۔ وہ ہر شے کو محیط ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمام علوم بلاواسطہ حاصل ہیں۔ انسانی علوم کی تقسیمات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم پر وارد نہیں ہوسکتیں۔ دو گروہ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم کے حوالے سے انحراف کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں عقیدے کے دو بڑے مسئلے پیدا ہوئے جن کو خود صحابہؓ نے ایڈریس کیا تھا۔

پہلا مسئلہ مرتکب کبیرہ کے حوالے سے تھا، یعنی جو شخص کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے اس کا کیا حکم ہے۔ وہ مؤمن ہے یا کافر ہے؟ اس کا انجام اللہ کے ہاں کیا ہوگا؟ پہلا فرقہ جو ظہور پذیر ہوا وہ خوارج ہیں، جن کا موقف تھا کہ مرتکب کبیرہ کافر ہے اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہے گا۔ یہی مسلک معتزلہ نے بھی اختیار کیا لیکن ایک ترمیم کے ساتھ۔ انہوں نے کہا کہ نہ وہ کافر ہے نہ مؤمن، بلکہ ایک نئی اصطلاح ایجاد کی کہ وہ منزلة بين المنزلتين (دو منزلوں کے درمیان ایک منزل) میں ہے اور آخرت میں اس کی نجات پھر بھی نہیں ہوگی۔ اس معاملے میں خوارج اور معتزلہ کا فرق یہ ہوگا کہ کافروں کا عذاب زیادہ شدید ہے جبکہ ان کا عذاب اس سے کم تر ہے، لیکن دائمی اور ابدی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ خوارج نے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہؓ کی تکفیر کی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان سے مناظرہ کے لیے گئے تو انہوں نے پوچھا کہ تم حضرت علیؓ کو کافر کیوں کہتے ہو! کہنے لگے کہ انہوں نے اپنے لیے امیر المؤمنین کا لقب اختیار نہیں کیا۔ یا تو یہ امیر المؤمنین ہیں یا یہ امیر الکافرین ہیں، درمیانی کوئی شے نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ''امیر الکافرین'' کہہ دیا۔ دوسری وجہ یہ بتائی کہ انہوں نے سیدنا معاویہؓ کے مسئلے میں حکم بنانا تسلیم کرلیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ (یوسف: ۴۰) ''اختیارِ مطلق تو صرف اللہ ہی کا ہے''۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے مسائل تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے دلائل دیے جس کے باعث بہت سے لوگ رجوع کر کے واپس بھی آ گئے۔

عقیدہ کا دوسرا مسئلہ جو سامنے ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم کا انکار ہے۔ اس کو ماننے والے قدریہ اوائل کہلاتے ہیں۔ دوسرا فرقہ فلاسفہ کا تھا جنہوں نے علم کا بالکلیہ انکار تو نہیں کیا لیکن علم کی ایسی تشریح کر دی جس کے نتیجے میں جزئیات کا علم اللہ کے علم شامل سے خارج ہو گیا۔ یوں اللہ تعالیٰ ایک ایسے وجود کے طور پر سامنے آیا جو مشینی اور میکانکی ہے، جس سے چیزیں صادر ہو رہی ہیں اور وہ خود بھی، معاذ اللہ! شاید اس سے واقف نہیں ہے۔ یا اگر اس

نے کائنات بنادی ہے تو وہ اتنی اہمیت کی حامل نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اس کی تدبیر کرتا رہے' بلکہ وہ اپنی ذات میں مگن ہے' اپنے بارے میں غور وفکر کر رہا ہے' اپنی محبت میں گرفتار ہے۔ نعوذ باللہ! یہ تصورات تھے جن کا اہلِ سُنّت نے ردّ کیا' اس لیے کہ نصوص بھی موجود ہیں اور عقلی دلائل بھی واضح ہیں۔ واضح رہے کہ اس طرح کے مسائل میں متکلمین صرف عقلی دلائل کی بنیاد پر نہیں چل رہے ہوتے۔ نصوص بھی اللہ کے علم کامل وشامل کے بارے میں بالکل واضح طور آگئی ہیں جو ہم دیکھ چکے ہیں۔

درس العقیدہ اور غرس العقیدہ

آج اللہ تعالیٰ کی صفت علم کے نتیجہ کے حوالے سے بات ہوگی۔ اس موضوع پر ایک شامی عالم دین الشیخ ادھم الآمسی کے دروس بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی عمر صرف ۳۸ سال ہے لیکن ان کو بہت سے علوم میں گرفت حاصل ہے' خاص طور پر عقلی علوم میں۔ جو لوگ عربی جانتے ہیں اور پڑھنا چاہتے ہیں ان کے لیے ان کے دروس اور کتابیں بہت مفید ہیں۔ ''المستوی الاول'' منطق پر دروس ہیں۔ پھر جس نے نحو پڑھنی ہو تو درجہ اول' درجہ دوم' درجہ سوم کے بعد درجہ چہارم میں جا کر عربی نحو کی ''قطر الندا ء'' ایک مشہور کتاب ہے۔ عقائد پر ان کے دروس کو سن کر محسوس ہوتا ہے کہ انہیں علوم میں بہت زیادہ تبحر ہے۔ وہ ایک اصطلاح استعمال کرتے ہیں کہ ایک ہوتا ہے درس العقیدہ' اور ایک ہوتا ہے غرس العقیدہ۔ غرس کہتے ہیں پودا لگانے کو۔ غَرَسَ' یَغرِسُ غَرساً۔ وہ کہتے ہیں کہ درسِ عقیدہ اور غرسِ عقیدہ ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ جیسے ہم نے صفت علم کو بیان کیا کہ صفة ازلیة وغیرہ' آپ کو قرآن کا اسلوب اس طرح نہیں ملے گا۔ یعنی ﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ﴾ میں عقیدے کا بیان بھی ہے کہ وہ جانتا ہے لیکن ساتھ غرسِ عقیدہ بھی ہے کہ اس عقیدہ کو دل میں اُتارا بھی جا رہا ہے۔ اس کا پودا لگایا جا رہا ہے جو اپنے برگ وبار لائے گا۔ کسی شخص کے لیے درسِ عقیدہ ضروری ہوتا ہے' کیونکہ اس کے ذہن میں اگر شبہات ہیں تو وہ بھی رد کرنے ہوتے ہیں یا اس کے عقائد میں ویسے خرابی ہے تو صحیح عقیدے کا بیان بھی مقصود ہوتا ہے۔ پھر ہم جیسے بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جنہیں درسِ عقیدہ سے زیادہ غرسِ عقیدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی ہمیں عقیدے کا پتا ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر شے کا علم رکھتا ہے لیکن پھر بھی ہم اس کے حضور کو اپنے اندر' اپنے اعمال میں اور اپنی حرکات وسکنات میں محسوس نہیں کر رہے ہوتے۔ عقیدہ کی سطح پر پوچھا جائے تو پوری علم کی تعریف بتا دی جائے گی کہ اللہ کی صفت علم کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ البتہ صفتِ علم کی وجہ سے کسی کے اندر کیا تبدیلی آرہی ہے' وہ اللہ کا مراقبہ کر رہا ہے کہ نہیں' وغیرہ وغیرہ یہ سارا غرسِ عقیدہ ہے۔ چنانچہ درسِ عقیدہ ایک ضرورت ہے عقیدے کو درست کرنے کے لیے' لیکن اس کے بعد جو اصل مقصود ہے وہ درسِ عقیدہ نہیں ہے کہ بس عقیدے کو پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور وہ عملی زندگی میں' احوال میں اور طبیعت میں ظاہر نہ ہو' بلکہ اس کو اپنے اندر جذب کرو۔ غرس کے نتیجے میں اس بیج سے ایک درخت یقیناً پھوٹنا چاہیے کہ جو برگ وبار لائے۔

اسی طرح امام رازیؒ نے بھی یہ بات بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک عقیدہ یا ایمان ہے دلیل اور برہان

کا‘اس کو کہتے ہیں ایمانِ دلیلی و برہانی‘ جبکہ ایک ہے ایمانِ ذوقی اور وجدانی۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کی آیت: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡکِتٰبِ الَّذِیۡ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ﴾(النساء: ۱۳۶) کی تین تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ یہ اہلِ کتاب سے خطاب ہے۔ اٰمَنُوۡا سے مراد ہے: آمِنُوا بموسیٰ‘ آمِنُوا بعیسیٰ‘ آمِنُوا بمحمد! بعض لوگوں نے کہا کہ یہ منافقین سے خطاب ہے۔ یاایھا الذین آمَنُوا بلسانکم آمِنُوا بقلوبکم یعنی دل سے بھی ایمان لاؤ۔ تیسری رائے بیان کی گئی کہ نہیں‘ یہ ان مسلمانوں سے ہی خطاب ہے جو حقیقی ایمان لا چکے ہیں۔ چنانچہ ہم پھر تفسیر بیان کرتے ہیں کہ ایمان میں پختگی حاصل کرو‘ ایمان کو بڑھاؤ۔ امام رازیؒ نے یہاں یہی تفسیر اختیار کی اور کہتے ہیں: یاایھا الذین آمنوا بالدلیل والبرھان ارتقوا بایمانکم الی الذوق والوجدان۔ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو دلیل و برہان کے ذریعے (یہ درسِ عقیدہ ہے) تو اپنے ایمان کو ترقی دو ذوق اور وجدان تک۔ یہ غرسِ عقیدہ ہے اور یہی مقصود ہے۔

غرس العقیدہ: امام غزالیؒ کا منہج

''احیاء العلوم'' میں امام غزالیؒ کا منہج دیکھیں تو وہ بھی اسی پر کھڑے ہیں۔ ''کتاب العلم'' اور ''قواعد العقائد'' پہلی دو کتابیں ہیں‘ اس کے بعد پوری ''احیاء العلوم'' غرسِ عقیدہ پر ہے۔ شروع میں انہوں نے بتادیا کہ علم کیا ہے‘ فرضِ عین کیا ہے‘ محمود کیا ہے‘ مذموم کیا ہے‘ علماءِ سوء کون ہیں‘ علماءِ حق کون ہیں‘ مناظرے کی آفات کون سی ہیں‘ عقل کس کو کہتے ہیں‘ اور اس کے بعد بتایا کہ عقائد کیا ہیں۔ ''احیاء العلوم'' بہت بڑی کتاب ہے‘ جس کے اندر چالیس کتابیں ہیں۔ ان میں سے ۳۸ کتابیں غرسِ عقیدہ ہیں کہ اس عقیدہ کو اپنے اندر اتارنا کیسے ہے۔ اسی طرح صفتِ علم ہے جو ہم نے دیکھ لی۔ اب ہمیں پتا چل گیا ہے کہ علم کے بارے میں کیا عقیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کے بارے میں کیا کیا انحرافات پیدا ہو گئے اور کون کون سے فرقے تھے۔ اس کے بعد جو اصل غرس ہے وہ یہ ہے کہ اس صفتِ علم کے ہمارے اندر کچھ نتائج پیدا ہو جائیں۔

صفتِ علم: قرآن کا اسلوب

صفتِ علم کے بارے میں قرآن مجید کا مخصوص اسلوب ہے۔ یہاں سے ہمیں معلوم ہوگا کہ قرآن نہ کلامی کتاب ہے‘ نہ فقہی متن ہے اور نہ حدیث کا متن ہے۔ یہ تو اللہ کا کلام ہے۔ لہٰذا قرآن سے علم کلام کا استنباط ضرور ہوتا ہے‘ اس سے اصولِ فقہ اور فقہ کا استنباط ضرور ہوتا ہے‘ لیکن یہ نہ کلام کی کتاب ہے‘ نہ فقہ اور اصولِ فقہ کی کتاب ہے۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام ہے۔ لہٰذا اس کا اسلوب بھی بالکل منفرد اور بے نظیر ہے۔ یعنی جس طریقے پر قرآن اللہ کا تعارف کروائے گا اس طریقے پر کوئی متکلم نہیں کروا سکتا۔ اس کی وجہ سے کچھ لوگ یہ بھی سمجھ لیتے ہیں کہ بس قرآن پڑھ لیں تو اس کے بعد ہمیں کچھ اور پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تصور غلط ہے‘ کیونکہ قرآن ہی سے یہ علوم مستنبط کر کے بتائے گئے ہیں۔ کئی دفعہ آپ غلط نتیجہ پر بھی پہنچ جاتے ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید سے اللہ گمراہ بھی کر دیتا ہے اگر صحیح طور پر قرآن کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ بہرحال قرآن پڑھیں اور یہ

علوم بھی پڑھیں‘ لیکن اس کے بعد جب قرآن کی طرف دوبارہ نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ قرآن کا اسلوب اور ہے۔ جیسے میں نے ایک آیت آپ کے سامنے رکھی تو اس میں صفتِ علم کا بیان تھا لیکن اس کے ذریعے اصلاح ہو رہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۝ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ﴾ (المؤمن) ''وہ جانتا ہے نگاہوں کی چوری کو بھی اور جو کچھ سینوں میں چھپا ہے اس کو بھی۔ اور اللہ فیصلہ کرے گا حق کے ساتھ۔'' یہ صفتِ علم کا بیان ہے‘ لیکن اس کے فوری بعد غرسِ عقیدہ ہے۔ يَعْلَمُ‘ اثباتِ علم ہے۔ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ‘ وہ جانتا تو ہے لیکن اس جاننے کو بس عقیدہ کی سطح پر اپنے ذہن میں بٹھانہ لو بلکہ اب دیکھو کہ وہ تمہاری نظروں کو بھی جان رہا ہے۔ وہ تمہاری آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے۔ وہ تمہارے باطن کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ظاہر کو بھی جانتا ہے۔ لہٰذا اس علم کی بنیاد پر جب وہ تمہاری آنکھوں کی حرکت کو بھی جانتا ہے‘ خیانت اور سینے کی مخفیات کو بھی جانتا ہے تو فیصلہ بھی برحق فرمائے گا۔ یہ تربیت ہے۔ اس لیے قرآن مجید پڑھتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ اس کا اسلوب ہی اور ہے۔ پتا نہیں چل رہا ہوتا کہ یہ عبارت آپ کی عقل کو مخاطب کر رہی ہے‘ یا آپ کی عاطفہ کو مخاطب کر رہی ہے‘ یا آپ کی کچھ اور وجودی فیکلٹیز کو مخاطب کر رہی ہے‘ یا آپ کے جسم کو مخاطب کر رہی ہے۔ ایک ہی آیت ہے جو آپ کی عقل کو بھی مخاطب کرے گی‘ آپ کی عاطفہ کو بھی‘ آپ کے احساسات کو بھی‘ آپ کی طبیعت کو بھی‘ آپ کے جذبات کو بھی‘ آپ کے ارادے کو بھی اور یہاں تک کہ آپ کے کُل وجود کو مخاطب کرے گی۔ ایسا کلام اللہ ہی کا ہو سکتا ہے کیونکہ وہ کُل وجود کا خالق ہے۔ اس کا کلام بھی کُل وجود کو مخاطب کر رہا ہوتا ہے۔ آپ کو سمجھ نہیں آ رہا پھر بھی آپ مخاطب بن رہے ہوتے ہیں‘ کیونکہ سمجھنا تو ایک فیکلٹی ہے اور وہ عقل ہے جبکہ انسان صرف عقل تو نہیں ہے۔

عقیدہ کے احوالی اور انفسی نتائج

اللہ کا کلام صرف عقل کو مخاطب نہیں کرتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الزمر: ۲۳)

''اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے کتاب کی صورت میں‘ جس کے مضامین باہم مشابہ ہیں اور بار بار دہرائے گئے ہیں۔ اس (کی تلاوت) سے اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر اُن کی کھالیں اور اُن کے دل اللہ کی یاد کے لیے نرم پڑ جاتے ہیں۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بہترین گفتگو نازل فرمادی ہے‘ کلام کہ جو متشابہ ہے۔ اس کے مضامین ایک دوسرے کے مانند ہیں‘ ملتے جلتے ہیں۔ ایک ہی مضمون کو مختلف انداز سے بیان کیا جاتا ہے جس سے اہلِ ایمان اور ان لوگوں کے جو اللہ سے ڈرتے ہیں‘ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یعنی جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں‘ تو بالوں پر بھی اس کا اثر ہو رہا ہے۔ بعض علماء نے اس طرح بیان کیا۔ صفتِ علم کو قرآن مجید میں کہیں بھی دیکھ لیں۔ سورۃ البقرۃ میں عائلی

قوانین کا ذکر ہوتا ہے اور اس کے آخر میں بتایا جاتا ہے کہ دیکھو اللہ دیکھ رہا ہے' اللہ جان رہا ہے۔ یعنی وہ محض فقہی ٹیکسٹ نہیں ہوتا بلکہ ایک فقہی حکم بیان کر کے ساتھ ہی ایمانی تربیت بھی ہو رہی ہوتی ہے۔ اسی طریقے پر ہر جگہ یہ بات ملے گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ وَہُوَ کُرۡہٌ لَّکُمۡ ۚ ﴾ ''(مسلمانو!) اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے اور وہ تمہیں گراں گزر رہی ہے۔'' یہ ایک فقہی حکم تھا' لیکن اس کے بعد فرمایا: ﴿ وَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ ﴾ (البقرۃ) ''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآں حالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔'' ﴿ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ ﴾ اصلاً آخر میں علت کا بیان ہے۔ جو اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے' لہٰذا تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے۔ یہ بھی صفتِ علم کا بیان ہے۔

اسی طرح کہیں علم کا بیان کر کے اس احساس کو پیدا کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت علمی اعتبار سے تمہارے ساتھ موجود ہے تو یہ غرسِ عقیدہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَمَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعۡرُجُ فِیۡہَا ؕ وَہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ ﴾ (الحدید: ۴) ''وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو کچھ نکلتا ہے اس سے' اور جو کچھ اُترتا ہے آسمان سے اور جو کچھ چڑھتا ہے اس میں۔ اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔'' اس میں یہ اشارہ بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ اگر عقیدہ یہ پیدا ہو جائے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ بھی آسمان سے اُترتا ہے اور آسمان میں چڑھتا ہے' لیکن آخر میں یہ کیفیت اور حال پیدا نہ ہو سکے کہ ﴿ وَہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ ﴾ تو گویا ایسا عقیدہ بس وہی کالی کوٹھڑی میں بند ہے۔ وہ عقیدہ محض ایک دماغی عقیدہ ہے جو وجود پر اثر انداز نہیں ہو رہا۔ چنانچہ اصل مقصود جہاں پہنچانا ہے وہ یہ ہے کہ ﴿ وَہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ ﴾۔ یہی مراقبہ ہے۔ مراقبہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہونے کا' اللہ تعالیٰ کے علم میں ہونے کا' اللہ کی سماعت و بصارت کا اعتقاد انسان کے اندر پیدا ہو۔ بہرحال وہاں پر تربیت ہو رہی ہے۔ صفتِ علم کا بیان غرسِ عقیدہ کے ساتھ ہے۔ درسِ عقیدہ کا بیان غرسِ عقیدہ کے ساتھ ہے۔

اسی طرح ارشاد ہوا: ﴿ وَعِنۡدَہٗ مَفَاتِحُ الۡغَیۡبِ ﴾ ''اور اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔'' ﴿ لَا یَعۡلَمُہَاۤ اِلَّا ہُوَ ؕ ﴾ ''جن کو اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' ﴿ وَیَعۡلَمُ مَا فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ؕ ﴾ ''اور بر و بحر میں جو کچھ ہے وہ جانتا ہے۔'' ﴿ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعۡلَمُہَا ﴾ ''اور کوئی ورق (پتا) نہیں گرتا مگر اس کے علم میں ہوتا ہے'' ﴿ وَلَا حَبَّۃٍ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۵۹﴾ ﴾ (الانعام) ''اور کوئی دانہ نہیں ہے زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی تر اور خشک مگر ایک روشن کتاب میں درج ہے۔'' یہ تو ایک نظری علم کا بیان ہو گیا۔ ہم سے اس کا کیا تعلق ہے' یہ آگے بیان کیا جا رہا ہے۔ ﴿ وَہُوَ الَّذِیۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ بِالَّیۡلِ وَیَعۡلَمُ

مَا جَرَحۡتُمۡ بِالنَّهَارِ ﴾ (الانعام: ۶۰) ’’اور وہی ہے جو تمہیں وفات دیتا ہے رات کے وقت اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو دن کے وقت۔‘‘ اللہ تعالیٰ رات کو تمہاری روح قبض کر لیتا ہے نیند کی حالت میں اور جو دن میں تم کارگزاریاں کرتے ہو وہ خوب جانتا ہے۔ یعنی صفتِ علم کو بیان کرنے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کو جانتا ہے‘ اگر تم یہ علم حاصل کر لو اور پھر تم یہ یقین نہ پیدا کر سکو کہ میرے دن میں جو میری حرکات وسکنات‘ افعال‘ ارادات‘ خواطر اور وساوس ہیں ان کو اللہ نہیں جانتا تو پھر اس علم کا کوئی فائدہ نہیں۔ یعنی یہ نہ کرنا کہ کائنات میں اللہ کی صفتِ علم کی وسعت میں کھو جانا‘ مگر آخر میں یہ یقین تمہیں حاصل نہ ہو سکے کہ وہ جان رہا ہے کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ اس کے فوری بعد بھی علم کا بیان ہے: ﴿وَهُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ وَيُرۡسِلُ عَلَيۡكُمۡ حَفَظَةً ؕ﴾ (الانعام: ۶۱) ’’اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب ہے اور وہ تم پر نگہبان بھیجتا رہتا ہے۔‘‘ پھر موت کا بیان آ گیا۔

کلامِ الٰہی کا منفرد تاثیری انداز

قرآن مجید کو اس طریقے پر پڑھیں تو عجیب سی کیفیت نظر آئے گی کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے‘ انسانی نفسیات سے برآمد ہوا کلام نہیں ہے۔ جس طرح وہ انسان کی تربیت کر رہا ہے‘ صفتِ علم سے اس کے اندر خوفِ خدا پیدا کرے گا‘ پھر موت کی طرف اس کو منتقل کر دیا اور وہ ساری چیزیں بیک وقت بیان کرے گا کہ جو اس کے وجود پر تاثیر رکھیں گی۔ چنانچہ محض صفتِ علم کا عقلی بیان اس کے وجود پر تاثیر نہیں رکھے گا بلکہ وہ رکھے گا جس کو ان تمام مؤثرات میں گھیر کر بیان کیا جائے گا۔ قرآن کا یہ اسلوب ہر جگہ نظر آئے گا۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:

﴿وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُ ۚ﴾ (آیت ۲۳۵)

’’اور جان رکھو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے‘ پس اُس سے ڈرتے رہو۔‘‘

یعنی صفتِ علم کا یہ نتیجہ ہے۔ جان لو کہ اللہ جانتا ہے تمہارے اندر کیا ہے ﴿مَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ﴾۔ لہٰذا ﴿فَاحۡذَرُوۡهُ ۚ﴾ خبردار رہنا۔ فَا یہاں پر سببیہ ہے۔ یہ خبردار رہنا اس صفتِ علم کا نتیجہ تھا‘ یعنی اس سے خبردار رہنا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سینوں کے حالات جانتا ہے۔

﴿وَاِنۡ تَجۡهَرۡ بِالۡقَوۡلِ فَاِنَّهٗ يَعۡلَمُ السِّرَّ وَاَخۡفٰى ۝۷﴾ (طٰہٰ)

’’اور اگر تم بلند آواز سے کوئی بات کرو وہ تو یقیناً جانتا ہے چھپی بات کو بھی اور نہایت مخفی بات کو بھی۔‘‘

اس طرح قرآن میں آپ پڑھتے چلے جائیں تو ہر جگہ آپ کو نظر آ جائے گا۔ کبھی صفتِ قدرت کے ذریعے اس طرح ہو رہا ہے‘ کبھی فلاں صفت کے ذریعے۔ تربیت کا ایک مستقل نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کے متوازی کوئی شے نہیں ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے۔ کئی دفعہ کلامی اور منطقیانہ مباحث اور اس طرح کی چیزوں سے انسان کو مناسبت ہو جاتی ہے لیکن کلام اللہ سے مناسبت نہیں ہوتی۔ یعنی کوئی شخص فلسفہ اور عقیدہ پر امام رازی‘ امام غزالی‘ ابن رشد اور ابن تیمیہ کو پڑھ رہا ہے لیکن بالآخر اُس کی کلام اللہ سے مناسبت ہوئی ہے یا نہیں! اللہ ربّ العزت کے کلام سے کتنی مناسبت ہے؟ اس سے تربیت کس طرح کی گئی ہے؟ اس سے تاثیر کتنی ہوئی ہے؟ کلام اللہ

محض عقلی بیان ہے یا ایک مؤثر شے ہے جو وجود میں تاثیر رکھتا ہے؟ بہرحال قرآن مجید کی تاثیر کو محسوس کرنا اور اس کے ذریعے تربیت لینا بھی باقی چیزوں کے ساتھ بہت ضروری ہے۔ اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیے کہ کلام اللہ سے ہمارا تعلق کتنا ہے۔ کلام اللہ سے تعلق جس قدر مضبوط ہوگا اس کا فائدہ اسی قدر زیادہ ہوگا۔ ان شاء اللہ!

آدم کی امتیازی صفت علم ہے

امام غزالیؒ کے کلام سے نوٹ کی گئیں چند باتیں آپ کو بتا دیتا ہوں' اس کے بعد صفتِ کلام کی طرف جائیں گے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صفت علم کی اپنی طرف بھی نسبت کی اور فرشتوں پر آدم کی وجہِ امتیاز بھی علم ہی تھا۔ یعنی جب انہوں نے کہا کہ آپ کی تسبیح وتقدیس تو ہم بھی کرتے ہیں تو آپ اسے کیوں وجود دے رہے ہیں' تو اس وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو وجہِ امتیاز بیان کی وہ صرف علم ہے۔ فرمایا:

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾﴾ (البقرۃ)

''اور اللہ نے سکھا دیے آدم کو تمام کے تمام 'نام' پھر اُن (تمام اشیاء) کو پیش کیا فرشتوں کے سامنے اور فرمایا کہ بتاؤ مجھے ان چیزوں کے نام اگر تم سچے ہو۔''

بعض مفسّرین نے یہاں سے یہ نکتہ نکالا کہ جب آپ نے کسی کی تعریف کرنی ہو' یعنی اس کی حد بیان کرنی ہو اور کوئی کہہ رہا ہو کہ جو کام یہ کرتا ہے وہ تو میں بھی کرتا ہوں تو آپ ایسی شے بیان کریں گے جو اس کی اصل خاصیت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس انسان کی اصل خاصیت تسبیح وتقدیس نہیں ہے لیکن اس کی اصل خاصیت تسبیح وتقدیس میں علم کے اعتبار سے مستقل اضافہ ہے۔

فرشتے اپنے علمی وجود میں بھی جامد (static) ہیں' جیسے قرآن حکیم کی ایک آیت سے علماء نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾﴾ (الصّٰفّٰت) ''اور ہم میں سے کوئی نہیں مگر اُس کے لیے ایک مقام مقرر ہے۔'' فرشتوں کی زبانی اللہ تعالیٰ بیان فرما رہا ہے کہ ہم میں سے کوئی نہیں ہے مگر اس کا ایک مقام معلوم ہے' جو اُس کو دے دیا گیا' وہ وہیں پر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تیسرے درجہ کا کوئی فرشتہ محنت کر کے' علم حاصل کر کے' اجتہاد کر کے' زیادہ عبادت کر کے اوپر پہنچ جاتا ہو۔ نہیں! اللہ تعالیٰ نے اس طریقے پر واضح فرما دیا کہ جبرائیلؑ کا مقام یہی ہے' اس تک کوئی اور نہیں پہنچے گا' باقیوں کا یہ ہے۔ انسان کا اس طریقے پر مقام معلوم نہیں ہے بلکہ:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴿۵﴾﴾ (التین)

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین حالت کی طرف۔''

انسان کے اندر تو اتنی خاصیت ہے کہ یہ فرشتے سے اعلیٰ ہو جائے یا نعوذ باللہ خنزیر سے بدتر ہو جائے۔ اس کے پاس domain اور مجال تو بہت وسیع ہے۔ انسان نے اللہ کے قریب ہونا ہے تو یقیناً عبادت اور تسبیح وتقدیس سے ہونا ہے' لیکن یہ عبادت علم کے ساتھ ہوگی۔ حضرت آدم علیہ السلام کی وجہِ امتیاز علم ہے۔ جتنا آپ اخلاص کے ساتھ

علم میں آگے بڑھیں گے‘ یقیناً اللہ کے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعا ’’رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا‘‘ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ یہ تقرب بالعلم ہے۔ ’’احیاء العلوم‘‘ کے شروع میں متعدد روایات آئی ہیں کہ جن میں اللہ کے نبی ﷺ نے عالم کو عابد پر فضیلت دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِیْ عَلٰی اَدْنَاكُمْ)) (رواہ الترمذی)

یعنی جیسے میری فضیلت تمہارے ادنیٰ پر ہے اسی طرح عالم کی فضیلت عابد پر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک عابد ہوتا ہے‘ ایک عالم ہوتا ہے جبکہ عالم عابد نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں ہے۔ دراصل عابد پر صفتِ عبادت غالب ہے اور عالم پر صفتِ علم غالب ہے لیکن وہ عابد بھی ہے۔ یہ عبادت کے ساتھ عالم ہے۔ لہٰذا یہ روایت نقل ہوتی ہے:

((فَقِيْهٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ))(رواہ الترمذی و سنن ابن ماجہ)

’’شیطان پر ایک فقیہہ ایک ہزار عابدین سے زیادہ بھاری ہے۔‘‘

اہلِ علم اہلِ خشیت ہیں

بہرحال اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا علم کے ذریعے مطلوب ہے۔ سورۃ الزمر کی آیت ۹ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ علم اور اس کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ بہت خوبصورت آیت ہے جس کا آخری حصہ آج کل لوگ quote کرتے ہیں یہ بتانے کے لیے کہ علم والے اور غیر علم والے برابر نہیں ہوتے: ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ﴾ (الزمر:۹) پوری آیت اس طرح ہے:

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ﴾ (الزمر:۹)

’’بھلا وہ شخص جو بندگی کرنے والا ہے رات کی گھڑیوں میں‘ سجود و قیام کرتے ہوئے‘ وہ آخرت سے ڈرتا رہتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار بھی ہے! (اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے؟‘‘

یہاں اہلِ علم کی صفات بیان کر دی گئیں۔ یہ نہیں کہ عالم بس علم میں مشغول ہیں اور ان کو عبادت سے کوئی رغبت و شغل نہیں ہے۔ نہیں! بلکہ وہ عابد بھی ہیں۔ ان کی عبادت ایک بصیرت کے ساتھ ہے۔ وہ معرفت کے حوالے سے مستقل ترقی میں ہیں۔ اصل میں تو صفتِ علم اللہ کے ہاں ہے‘ وہ العلیم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝۷۶﴾ (یوسف) ’’اور ہر صاحبِ علم کے اوپر کوئی اور صاحبِ علم بھی ہے۔‘‘ چنانچہ اپنے علم میں اور علم باللہ میں مستقل اضافے کی حالت میں رہنا اللہ کے قریب ہونے کا ذریعہ ہے۔ ’’تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ‘‘ کے ذریعے اللہ کے قریب ہوں گے اسی صفت کو حاصل کر کے اور علم میں اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ تقرب الی اللہ بھی علم کے ذریعے ہوگا۔ لہٰذا علم اس لحاظ سے فضیلت ہے۔

پھر وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں غور کریں تو علم اور خشیت ساتھ ساتھ ہیں۔ جیسے مشہور آیت ہے: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ﴾ (فاطر:۲۸) ’’یقیناً اللہ سے ڈرتے تو اُس کے بندوں میں سے وہی ہیں جو

اہلِ علم ہیں۔'' اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جو ڈرتا ہے وہ عالم ہے۔ یعنی علم لازمی طور پر خشیت پیدا کرے گا۔ اس کے ساتھ اللہ کے نبی ﷺ کی حدیث جوڑ لیں تو بات مکمل ہو جائے گی۔ وہاں بھی آپ ﷺ نے علم کو خشیت کے ساتھ جوڑا ہے۔ فرمایا: ((اِنَّ اَتْقَاکُمْ وَاَعْلَمَکُمْ بِاللّٰہِ اَنَا)) ''بے شک مَیں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سب سے زیادہ اسے جانتا ہوں۔'' یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر علم تکبّر پیدا کر رہا ہے' علم کے ذریعے سختی اور قساوت پیدا ہو رہی ہے تو یہ وہ علم نہیں ہے جو اللہ کے قریب کر دے۔ حقیقی علم وہ ہے جس کے ذریعے انسان اللہ کا تقرب حاصل کرے گا۔ اس کے نتیجے میں خشیت اور تواضع پیدا ہوتی ہے جبکہ تکبر اور استکبار کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہی علم مقصود ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ حقیقی علم کے اعتبار سے علم اور خشیت لازم و ملزوم ہیں۔ علم والوں کے اندر خشیت کا اثبات اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ کیا ہے۔ علم خشیت کے بغیر نہیں ہے۔ لہٰذا جو عالم ہے وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہے' متقی ہے اور انہی کو ہم علماء حق اور علماء ربانیین کہتے ہیں۔

ازدیادِ علم باعثِ اعترافِ جہالت ہے

اسی سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ آپ اللہ کی صفتِ علم کے سامنے ہیں اور آپ علم میں اضافہ چاہ رہے ہیں' تو جتنا آپ کے علم میں اضافہ ہوتا ہے آپ پر اپنی جہالت کے نئے نئے انداز اور آفاق کھلتے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا جتنا انسان علم میں بڑھے گا اتنا ہی اس میں اپنی جہالت کا اعتراف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یعنی علم میں بڑھنے کے نتیجے میں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ میرا علم بڑھتا چلا جا رہا ہے بلکہ چونکہ وہ علوم کی نئی نئی دنیائیں دیکھ رہا ہے اور اللہ کی معرفت میں بڑھتا چلا جا رہا ہے تو علم کے ہر موڑ' مرحلے اور منزل پر اس کو اپنی جہالت کے نئے نئے آفاق نظر آتے ہیں۔ جس کو واقعی جہالت کا اعتراف ہو جاتا ہے اس کے اندر تواضع پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جاہل متکبر نہیں ہوتا جس کو اپنی جہالت کا پتا ہو۔ متکبر وہی ہوتا ہے جسے اپنی جہالت کی خبر نہیں ہوتی۔ یہ تواضع بھی علم کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ آپ کے سامنے لامحدود اللہ کی صفت ہے اور جتنا مرضی آپ جانتے چلے جائیں' کوئی نسبت پیدا نہیں ہوگی۔ لہٰذا وہاں ہر وقت سر جھکا رہے گا کہ میں کچھ نہیں ہوں اور کچھ کر نہیں سکتا۔

پھر وہ کہتے ہیں کہ صفتِ علم کا نتیجہ یہ ہے کہ جب اللہ کے علم شامل کو جان لیتے ہو تو یہیں سے مراقبہ پیدا ہوتا ہے' یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نظر میں ہونے کا احساس۔ یہ صرف نمونہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے' باقی صفات میں بھی ایسا ہی ہے۔ یعنی کس طریقے پر درسِ عقیدہ غرسِ عقیدہ ہے۔

مراقبہ کا مطلب

درسِ عقیدہ محض اپنی ذات میں مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ نتائج بھی ہمیں اپنے اندر پیدا کرنے ہیں۔ مراقبہ یہ ہے کہ مَیں اللہ کی نگاہ میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرے خواطر' افکار' خیالات اور وساوس سب کو جانتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا مراقبہ صرف اپنے ظاہری اعمال ہی میں نہیں بلکہ باطن میں بھی کرنا اصل مراقبہ ہے۔ مراقبہ کا مطلب صرف ظاہری اعمال پر اللہ کی نگاہ دیکھنا نہیں ہے بلکہ جو حدیث نفس ہے' جو اپنے سے گفتگو چل رہی ہے اس پر بھی

اللہ کا مراقبہ کرو اور سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ یہ بھی جان رہا ہے۔ اگر فلاں کے بارے میں اپنے نفس کو بتا رہے ہو کہ یہ بندہ ٹھیک نہیں ہے تو درحقیقت تم ٹھیک نہیں ہو۔ لہٰذا یہاں مراقبہ اختیار کرو۔ چنانچہ صفتِ علم کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان صرف اپنے ظاہر ہی میں نہیں بلکہ اپنے افکار کی دنیا میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا مراقب ہو۔ اللہ کو نگران کے طور پر دیکھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾﴾ (الرحمٰن)

''اور جو کوئی اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اُس کے لیے دو جنتیں ہیں۔''

مَقَامَ رَبِّهٖ کی دو تفسیریں کی گئیں۔ ایک یہ کہ جو اپنے رب کے سامنے قیامت کے دن کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے' اور دوسری یہ کہ جو اپنے ربّ کے قیام یعنی نگرانی سے ڈرتا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ میری نگرانی فرما رہے ہیں۔ اسی کو مراقبہ کہتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴿۱﴾﴾ (النساء)

''یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔''

اللہ کو رقیب بنانا مطلوب ہے' دشمن نہیں۔ رقیب سے مراد ہے: دیکھنے والا۔ یہی مراقبہ ہے۔

اخلاصِ نیت بھی اللہ کی صفتِ علم کی معرفت کا نتیجہ ہے

امام غزالی کہتے ہیں کہ نیت کا اخلاص بھی صفتِ علم سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جو آیات آئی ہیں کہ:

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾﴾ (النساء)

''اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو جان لو کہ اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔''

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ﴾ (البقرة)

''اور جو بھی مال تم خرچ کرو گے وہ تمہارے اپنے لیے بہتر ہے۔ اور تم نہیں خرچ کرو گے مگر اللہ کی رضا جوئی کے لیے۔''

اسی طرح کی بہت سی آیات ہیں کہ جو بھی تم کرو گے' اللہ تو اس کو جانتا ہے۔ یہ صفتِ علم کا بیان ہے۔ انسان کے اندر خواہش تو ہے کہ دنیا میں اس کے اعمال کی خبر ہو جائے۔ فرمایا یہ جا رہا ہے کہ دیکھو اللہ کے علم پر اکتفا کرو۔ یعنی جو خیر کا عمل کر رہے ہو وہ اللہ تو جانتا ہے جس کے لیے تم کر رہے ہو اور وہ اصل ہے وجود کی۔ وہی واجب الوجود ہے' وہی اس کائنات کا مالک ہے۔ لہٰذا اگر اس نے جان لیا ہے تو تمہیں کیا ضرورت ہے کہ ہر ایک کو دکھا دیں۔ بلا تمثیل اگر آپ اپنی جاب میں بہت محنت کر رہے ہیں اور آپ کے باس کو خبر ہو گئی ہے کہ آپ محنت کر رہے ہیں تو پھر کسی چپڑاسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دیکھو میں کتنی محنت کر رہا ہوں' کیونکہ جس نے آپ کو انعام دینا ہے اس کو خبر ہو چکی ہے اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ لہٰذا اگر تم صفتِ علم پر ایمان رکھتے ہو اور اللہ کے علم پر تمہارا اکتفا نہیں بلکہ دوسروں کو خبر دینے کے چکر میں ہو تو یہ نیت کا فساد ہے۔ بہرحال وہ کہتے ہیں کہ علم کے ذریعے نیت کی اصلاح

کرو‘ اخلاص پیدا کرو‘ ریا کاری سے بچو۔ اللہ نے جان لیا ہے تو بس کافی ہے ۔ باقی کسی کو خبر ہو نہ ہو‘ اور نہ ہی ہو تو اچھی بات ہے۔ فرماتے ہیں کہ نیت کا اخلاص بھی اس سے پیدا ہو جاتا ہے۔

پھر کہتے ہیں کہ سرِتسلیم خم ہونے کا مطلب ہے کہ شریعت پر اعتراض نہیں ہوگا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ وَهُوَ كُرۡهٌ لَّكُمۡ ﴾ ’’(مسلمانو!) اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے اور وہ تمہیں گراں گزر رہی ہے۔‘‘ اور آخر میں وجہ بیان کی: ﴿ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ ﴾ ’’اور اللہ جانتا ہے‘ تم نہیں جانتے۔‘‘ یعنی جب تم یہ جان چکے ہو کہ اللہ کا علم شامل ہے‘ علم محیط اور علم وسیع ہے اور وہ حکیم ہے تو پھر اس کے بعد اپنی ناقص رائے سے‘ یعنی سوائے جاہل (جس نے اپنے آپ کو کچھ سمجھا) کے اللہ پر اور کون اعتراض کرے گا۔

حکم کی بنیاد حکم کا ثبوت ہے نہ کہ اس کی حکمت

جو واقعی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت ِعلم کو اور اپنی صفت ِعلم کو جان چکا ہے اور تواضع پیدا کر چکا ہے‘ اس کے لیے محض یہ کافی ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اس کے لیے مدارِ حکم ثبوتِ حکم ہوتا ہے‘ حکمت ِحکم نہیں ہوتی۔ یعنی وہ مدارِ حکم یہ بنائے گا کہ یہ حکم ثابت ہے کہ نہیں ۔ اللہ نے کہا ہے یا نہیں کہا۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ مدارِ حکم ثبوتِ حکم ہے۔ البتہ یہ تحقیق کر سکتے ہیں کہ حدیث ہے تو کہیں وہ موضوع تو نہیں ہے۔ باقی ثابت ہو گیا اور پتا چل گیا اور اس کی تعبیر بھی سامنے آ گئی تو اب سرِتسلیم خم ہے‘ کیونکہ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ لہٰذا جب تم نہیں جانتے تو پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر اعتراض کیسا! شریعت پر سارے اعتراضات اصلاً تکبر‘ جہالت اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت نہ ہونے کے نتیجے میں پیدا ہو رہے ہوتے ہیں ۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر اللہ کی معرفت پیدا کر لو اور اللہ کے علم کو جان لو تو پھر یہ کہتے ہوئے شرم آئے گی کہ اس میں کیا حکمت ہے‘ مجھے نہیں سمجھ آ رہی‘ اے اللہ مجھے بتا دے۔ حکمت معلوم ہو جائے تو فبہا‘ بہت اچھی بات ہے۔ اس سے مزید انشراحِ صدر ہو سکتا ہے لیکن عمل کرنے کے لیے حکمت کی تلاش میں رہنا اللہ کو ماننے والوں کا طریقہ نہیں ہے ۔ یہ طریقہ ’’العلیم‘‘ اور ’’الحکیم‘‘ کو ماننے والوں کا نہیں ہے ۔ ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَا يَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ ﴾ (الملک : ۱۴) ’’وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا!‘‘ پھر کہتے ہیں کہ وہی سرِتسلیم خم تو شریعت کے سامنے ہے اور اللہ کی رضا‘ قضا اور تفویض کی ایک کیفیت پیدا ہو جانا کہ جب یہ جان لیا کہ اللہ ہر شے جانتا ہے۔ جیسے مثال دی کہ دُعائے استخارہ اصلاً تفویض کی ایک کیفیت ہے ۔ اس میں کہا جاتا ہے: ((وَ تَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ)) (صحیح البخاری) یقیناً تُو جانتا ہے‘ میں نہیں جانتا۔ یعنی تجھے معلوم ہے کہ میرے لیے خیر کیا ہے اور کیا خیر نہیں ہے ۔ یہاں شریعت کی بات نہیں ہو رہی‘ کیونکہ استخارہ ان معاملات میں ہو سکتا ہے جو مباح ہیں ۔ جہاں شریعت نے حلال وحرام واضح کیا ہے وہاں استخارہ نہیں کر سکتے بلکہ ایسا کرنا گناہ ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ استخارہ کفر تک پہنچا سکتا ہے‘ یعنی تم اللہ کو یہ بتا رہے ہو کہ اگر حرام ہے تو میرے لیے خیر ہے۔ اللہ تو بتا چکا ہے کہ حرام میں خیر نہیں ہے۔ وہ تو اپنی شریعت کے ذریعے بتا چکا ہے‘ اب تم اللہ کو بتانا چاہ رہے ہو؟ لہٰذا استخارہ مباحات میں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں یہ بھی کر سکتا ہوں‘ یہ بھی کر سکتا ہوں لیکن مجھے نہیں پتا‘ میرا علم ناقص

ہے تو میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ یہ سپردگی تفویض کہلاتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۴۴﴾﴾ (المؤمن)

''اور مَیں تو اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ اللہ یقیناً اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔''

وہ فرماتے ہیں کہ اسی کے نتیجے میں رِضا پیدا ہوتی ہے۔ اس کو رِضا بھی کہتے ہیں اور رَضا بھی ہے۔ رضا یہ ہے کہ اللہ نے میرے لیے جو کیا ہے وہ یقیناً خیر ہے چاہے وقتی طور پر اس میں کچھ پریشانی بھی ہو۔ جو بھی اللہ کی طرف سے فیصلہ ہے' بندۂ مؤمن کے لیے خیر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عَجَبًا لِأَمر المُؤمن إنَّ أمرَہ كُلَّه لَهُ خَير، وَلیس ذٰلك لِأَحَدٍ إلَّا لِلمُؤمِن: إنْ أَصَابَته سَرَّاءُ شَكَرَ فكان خيرًا له، وإنْ أَصَابته ضَرَّاءُ صَبَر فَكَان خيرًا له))(رواہ مسلم)

''صاحبِ ایمان کا معاملہ بہت تعجب خیز ہے کہ اس کے تمام معاملات اس کے لیے خیر ہیں اور یہ بات مؤمن کے سوا کسی اور کو میسّر نہیں ہے۔ اچھائی پہنچے تو شکر کرتا ہے تو یہ اس کے لیے بہترین ہے' اور تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لیے بہترین ہے۔''

اس کے نتیجے میں تفویض بھی ہے' اللہ کو معاملات سونپ دینا بھی ہے اور اللہ کی طرف سے جو فیصلہ آیا اس پر راضی رہنا بھی ہے۔ یہ سارے نتائج صفتِ علم ہی پیدا کر رہی ہے۔ یہ نتائج ہیں جو اس صفت کے نتیجے میں پیدا ہونے چاہئیں۔

اہلِ علم کا ادب واحترام

جب یہ پتا چل گیا کہ صفتِ علم کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے اور جو جتنا صفتِ علم میں کمال حاصل کرے گا وہ اتنا اللہ کے قریب ہوتا چلا جائے گا تو اس کے نتیجے میں علماء ربانییّن' جو اس علم کے ذریعے اللہ کو جان رہے ہیں اور اللہ کی شریعت اور اس کے علوم سے واقف ہیں تو ان کی تعظیم اور احترام بھی اسی درجے میں بڑھتی چلی جائے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ علم کوئی مجرد شے ہے جو کہیں پائی نہیں جاتی۔ کچھ لوگوں میں یہ نہیں پائی جائے گی جبکہ کچھ اصحابِ علم ہوں گے۔ فرقِ مراتب کا جو ایک نظام ہے ہماری پوری روایت میں' وہ یہ ہے کہ کچھ علماء ہوتے ہیں' کچھ نہیں ہوتے۔ کچھ عوام ہوتے ہیں' کچھ خواص ہوتے ہیں۔ یہ ایک فطری ترتیب ہے۔ علماء کا احترام ہوگا' یہ نہیں ہے کہ سب کو اٹھا کر ایک سطح پر لے آؤ۔ عوام کو علماء کے درجے پر پہنچا دو یا علماء کو عوام کے درجے پر پہنچا دو۔ بہرحال علماء کا احترام ہونا چاہیے۔ اس زمانے میں حفظِ مراتب اور فرقِ مراتب تو کوئی رہا ہی نہیں۔ اب نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ ایک صاحب نے ایک جملہ بولا جس پر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ انہوں نے فرمایا: ''ہم تو عوام کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کرتے ہیں اور عوام کی عدالت میں تو علمی دلائل ہی چلتے ہیں۔'' یہ جملہ خود بتا رہا ہے ان کا علمی لیول کیا ہے' اس وقت کا علمی ماحول کیا ہے۔ یعنی فرقِ مراتب اور حفظِ مراتب سب رخصت ہوئے۔ آتا جاتا کچھ نہیں لیکن علماء کے متعلق ایسی گفتگو فرما رہے ہوں گے' زبان درازی بھی کریں گے دیکھے بغیر کہ یہ تاویل بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی حسن ظن کا بھی مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اللہ کی پناہ!

علماء ابن عساکر (تاریخ دمشق والے) کا ایک جملہ quote کرتے ہیں: لحوم العلماء مسمومة

’’علماء کا گوشت زہریلا ہے۔‘‘ یعنی عام آدمی کی غیبت کریں گے تو تب بھی گوشت مردہ بھائی کا کھا رہے ہیں لیکن وہ زہریلا گوشت نہیں ہے۔ آپ کہیں کہ مَیں علماءِ ربانیین کی غیبت نہیں کرتا‘ تو کیا آپ کو وحی آئے گی کہ یہ عالمِ ربّانی ہے یا نہیں! کیسے پتا چلے گا؟ آپ نے میڈیا کے ذریعے کسی کی تصویر دیکھ لی‘ ہوسکتا ہے وہ علماء ربانی میں سے ہو۔

سوشل میڈیا کا فتنہ

آج کل کا میڈیا بالخصوص سوشل میڈیا پر فعال لوگ کسی شیطان کو ولی ثابت کر سکتے ہیں اور کسی ولی اللہ کو شیطان۔ ﴿اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا﴾ (الحجرات: ۶) والی آیات کدھر ہیں۔ اگر آپ میڈیا پر پھیلی ہوئی تصاویر یا کسی کا سکینڈل نکال کر دکھاتے رہیں گے اور اس پر اعتماد کر کے کسی کے متعلق رائے قائم کریں گے تو پھر خود فاسق ہو جائیں گے‘ کیونکہ فاسقوں کی خبروں پر اعتماد کر کے کسی کے بارے میں رائے قائم کرنا خود فسق میں مبتلا ہو جانا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں جہاں فسق کا مرتبہ آپ خود سمجھ لیں کہ کیا ہوگا‘ اللہ تعالیٰ ان کو یہ تعلیم دے رہے ہیں: ﴿اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا﴾ ’’اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو۔‘‘ ایسی نبأ جس سے میرا لینا دینا کوئی نہیں ہے وہ لائق اعتناء ہی نہیں۔ مثلاً فلاں عالم کے متعلق مجھے خبر پہنچی تو مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اس پر تحقیق کرنے بیٹھ جاؤں یا جو آدمی مجھے خبر دے رہا ہے‘ اس کو جھوٹا سمجھوں کیونکہ وہ غیبت کر رہا ہے۔ مجھے اس خبر سے کیا فائدہ ہے۔ اگر تو وہ شخص واقعی گمراہی پھیلا رہا ہے تو پھر لوگوں کو خبردار کرنا چاہیے‘ لیکن اِدھر اُدھر کی بحثیں کہ فلاں کے متعلق مجھے یہ پتا چلا‘ بے کار ہیں۔ نہ میری اس سے ملاقات ہے نہ کچھ ہے۔ چنانچہ فلاں کی خبر دینے والا غیبت کر رہا ہے‘ اور فاسق کی تصدیق نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ فاسق ہے۔ کجا یہ کہ میں اس کی تصدیق بھی کر دوں اور یہ کہوں کہ بات تو یقیناً ایسے ہی ہوگی۔ اچھی خبر کی تصدیق کرنی نہیں ہوتی‘ بری کی فوری کر دیتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل بہت ہی گھٹیا ہے۔ یوٹیوبرز کی سکینڈلز والی ویڈیوز‘ پھر اس کو دیکھنے والے‘ اس پر توجہ کرنے والے‘ اس کو پھیلانے والے اور اس پر مجالس میں گفتگو کرنے والے کس قدر بڑی تعداد میں ہیں۔ اگر کسی کی اچھی خبر ہوگی تو لوگ اس کو سرسری دیکھیں گے اور گزر جائیں گے۔ آج کل یہ طرزِ عمل ہے۔

زبان درازی اور فرقِ مراتب وحفظِ مراتب کا خیال نہ رکھنا بھی ایک فتنہ ہے۔ بہر حال اہلِ علم کا ایک احترام ہے۔ جس شخص کو آپ نہیں جانتے اور اس کے متعلق کوئی خبر کسی ایسے ذریعے سے پہنچ رہی ہے کہ جس کی تکذیب بآسانی ہوسکتی ہے تو پھر اس ذریعے کی تکذیب ضروری ہے اور اس شخص کے بارے میں حسنِ ظن رکھیں کہ وہ اللہ کا ولی ہے۔ ہر مسلمان کے بارے میں یہ حسن ظن رکھنا ضروری ہے کہ وہ اللہ کا ولی ہوسکتا ہے۔ اس حسن ظن پر قیامت کے دن کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔ اگر بغیر دلیل کے سوئے ظن رکھ لیا اور رائے قائم کر لی‘ اس پر جم گئے اور جہالت میں‘ بغیر علم کے‘ اعتراضات شروع کر دیے تو اس پر پکڑ ہو جائے گی۔ جس کا علم جتنا زیادہ ہے‘ ہوسکتا ہے اس کے پاس اعمال کے کچھ اتنے ہی عذر بھی ہوں۔ لہٰذا اپنی جہالت میں اس عذر کو نہ جانتے ہوئے ایک حکم لگا دیا

جاتا ہے۔ یہ آج کل بولنے کا ایک فیشن ہے کہ فلاں کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ میں کون ہوتا ہوں رائے دینے والا‘ اچھا ہی آدمی ہوگا‘ ان شاء اللہ۔ امید تو یہی ہے کہ وہ اللہ کا ولی ہوگا۔ بزرگوں سے مروی ہے: لا تحقرن احدا عسیٰ ان یکون ولی اللہ ۔کسی کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھ لینا کیا پتا اللہ کا ولی نکل آئے! خصوصاً جو علماء ہیں‘ یعنی حقیقی علماء ہیں‘ ان کا احترام بھی بہت ضروری ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی ان کا احترام کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴾ (الزمر :۹)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے ؟‘‘

اہلِ علم کی فضیلت کی سب سے بڑی آیت جس کا حوالہ دیا جاتا ہے‘ یہ ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ﴾

(آل عمران :۱۸)

’’اللہ خود گواہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور سارے فرشتے اور اہل علم بھی (اس پر گواہ ہیں) وہ عدل وقسط کا قائم کرنے والا ہے۔‘‘

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین لوگوں کو جمع کیا۔ ایک اپنی ذات مبارکہ کو: شَهِدَ اللّٰهُ‘ پھر فرشتوں اور اس کے بعد اُولُوا الۡعِلۡمِ کو۔ لہٰذا علماء کے احترام اور اپنی جہالت کے اعتراف کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہمارے دین میں کچھ مراجع ہوتے ہیں‘ کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے آپ رجوع کرتے ہیں‘ ان سے علم سیکھتے ہیں‘ ہم ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔

ھم رجال و نحن رجال کا سُوءِ استعمال

آج کل یہ جملہ بھی عام ہے کہ ھم رجال ونحن رجال۔ مثلاً امام ابوحنیفہ ؒ بھی انسان تھے گوشت پوست کے‘ ان کی بھی آنکھیں تھیں‘ ہماری بھی ہیں۔ فزیکل سائنس میں یہی کہا جائے گا‘ لیکن یہ بالکل فضول بات ہے۔ کہاں وہ رجال اور کہاں تم رجال! کسی نے اس کو لطیف پیرائے میں کہا ہے کہ وہ جنگ میں رجال تھے اور تم بستروں پر رجال ہو۔ یعنی انسان کی رجولیت (مردانگی) یہاں سے نہیں پتا چلتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ رِجَالٌ صَدَقُوۡا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیۡهِ ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَهٗ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ ۫ۖ﴾ (الاحزاب :۲۳)

’’اہل ایمان میں وہ جواں مرد لوگ بھی ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا وہ عہد جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔ پس ان میں سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے اور ان میں سے کچھ انتظار کر رہے ہیں۔‘‘

سارے مؤمنین رجال نہیں ہیں۔ لہٰذا صفت رجولت‘ صفت فتوءت اور صفت مروءت‘ یہ تین صفات ہمارے صوفیاء بیان کرتے ہیں اور یہ تینوں مردانگی سے ہیں۔ رجل سے رجولت‘ مرء سے مروءت اور فتاء سے فتوءت۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ایک عورت اپنے اندر رجولت رکھتی ہو جس کو آج کل اخت رجال کہتے ہیں‘ یعنی

مردوں کی بہن ہے۔ بعض نے کہا کہ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ البتہ یہاں رجال سے مراد رجال اللہ ہیں۔ سورۃ النور میں فرمایا گیا:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿٣٧﴾﴾

''وہ جواں مرد جنہیں غافل نہیں کرتی کسی قسم کی کوئی تجارت یا خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے' نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے' (اس سب کچھ کے باوجود بھی) وہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں اُس دن کے تصور سے جس دن الٹ جائیں گے دل اور نگاہیں۔''

بہرحال ھم رجال ونحن رجال کہنے میں تو بہت آسان ہے' اور شاید ان کو اتنا جملہ ہی یاد ہوتا ہے کُل علوم میں سے۔ مجھے نہیں لگتا کہ جو شخص بھی علماء سلف کو پڑھے گا تو ان کے علمی مدارک' وسعتِ فکری اور ان کے کام کو دیکھنے کے بعد منہ سے یہ نکالے کہ میں اور وہ برابر ہیں۔ اس کو شرم آئے گی اور وہ ڈوب مرے گا اگر وہ یہ بات کہے۔ جس کو عبارت بھی ٹھیک سے پڑھنی نہیں آ رہی' اس کا قرآن کا تلفظ ٹھیک نہیں ہے' لیکن وہ بھی یہ دعویٰ کرے کہ ''ھم رجال و نحن رجال''۔ بہرحال یہ ساری چیزیں بھی صفتِ علم پڑھنے کے نتیجے میں پیدا ہونی چاہئیں۔

آج کا ہمارا درس اصلاً درسِ عقیدہ نہیں بلکہ غرسِ عقیدہ تھا۔ پھر بھی یہ درس ہی ہے۔ درس سے غرس ہوتا نہیں ہے' وہ تو پھر انسان نے خود کرنا ہوتا ہے۔ یعنی صفتِ علم پیدا کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا:

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ﴾ (الزمر:۹)

''بھلا وہ شخص جو بندگی کرنے والا ہے رات کی گھڑیوں میں' سجود و قیام کرتے ہوئے' وہ آخرت سے ڈرتا رہتا ہے' اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار بھی ہے!''

تو پھر یہ کام شروع کریں۔ یہ صفات پیدا کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے سرٹیفکیٹ مل رہا ہے کہ تم صاحبِ علم ہو: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ﴾ خشیت پیدا کریں علم کے ساتھ۔ جو خشیت علم کے ساتھ ہوگی' اللہ کے فضل سے وہ شیطان کے حملوں سے محفوظ ہوتی ہے' جبکہ جو خشیت اور عبادت بغیر علم کے شروع ہو جاتی ہے تو وہ خوارج تک بھی پہنچا سکتی ہے یا کسی اور گمراہی میں پھینک سکتی ہے۔ اگر ایک شخص صاحبِ علم نہ ہو تو پھر وہ اصحابِ علم سے جڑ جائے۔ جس طرح اگر اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے اور آپ نہیں جانتے تو جاننے والوں سے تعلق قائم کر لیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ میرے متعلق بھی خبیر سے پوچھ لو۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ۚ ﴿٥٨﴾ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿٥٩﴾﴾ (الفرقان)

''اور آپؐ توکّل کیے رکھئے اُس زندہ جاوید ہستی پر جسے کبھی موت نہیں آئے گی' اور اُس کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے۔ اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے کے لیے کافی ہے۔ وہی کہ جس نے پیدا کیا آسمانوں اور

زمین کو اور جو کچھ اُن کے مابین ہے چھ دنوں میں‘ پھر وہ متمکّن ہو گیا عرش پر۔ وہ رحمٰن ہے! تو پوچھ لو اس کے بارے میں کسی خبر رکھنے والے سے۔‘‘

رحمٰن ہے وہ ہستی جس نے زمین و آسمان پیدا کیے‘ اس کے بارے میں کسی باخبر سے پوچھ لو۔ بہرحال اصحابِ علم کا صرف احترام نہیں ہوگا بلکہ ان سے جڑنا بھی ضروری ہوگا‘ کیونکہ ان سے ہم نے پوچھنا ہے: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ﴾ (النحل:۴۳) ایک عابد اگر محض عبادت ہی میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے اندر علم کا کوئی خاص ذوق نہیں تو کوئی مسئلہ نہیں‘ پھر وہ صاحبِ علم سے جڑ جائے۔ جب وہ صاحبِ علم سے جڑ جائے گا تو وہ اس کی عبادت کو ٹھیک نہج پر کر دیں گے۔ اگر نہ وہ کسی صاحبِ علم سے جڑے‘ نہ وہ خود صاحبِ علم ہو اور پھر عبادت کی ایک راہ پر نکل جائے تو ایسے میں شیطان اس کو بڑے طریقوں سے بھٹکا سکتا ہے۔ وہ شیطان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اصحابِ علم کا احترام ہو‘ کیونکہ جس سے جڑیں گے تو پہلے اس کا احترام کریں گے۔ اگر آپ اس کا احترام بھی اپنے دل میں نہیں رکھتے تو جڑنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفتِ علم کا ایک پرتو اور ایک عکس ان کے اندر پیدا ہو رہا ہے تو اس کی وجہ سے ان کا احترام ہے اور اس کے نتیجے میں ان سے جڑنا ہے۔ یہ ساری چیزیں صفتِ علم سے متعلق ہیں جو ہمیں سیکھنی چاہئیں۔ یہاں ہم صفتِ علم مکمل کر چکے۔

[یاد رہے کہ درس ۱۶ چونکہ ضروری مباحثِ عقیدہ کا احاطہ کرتا تھا‘ لہٰذا اسے درس 1 کے فوراً بعد دے دیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو: شمارہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۲۰ء]

❁❁❁

بقیہ: فہم القرآن

نوٹ: آیت ۲۱ میں جو مکالمہ نقل کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قیامت میں یہ عذر قبول نہیں کیا جائے گا کہ میں بے قصور ہوں‘ فلاں نے مجھے بہکا دیا تھا‘ اس لیے مجھے کچھ نہ کہو بلکہ اس کو پکڑو۔ اس آیت سے بھی اور قرآن کی متعدد دوسری آیات سے بھی یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ غلط عقائد ونظریات کے داعی اور غلط راہ دکھانے والوں کے ساتھ ان کی اندھی تقلید کرنے والے بھی مجرم قرار دیے جائیں گے۔ اس اصول کی وجہ بھی اور دلیل بھی اگلی آیت میں شیطان کا قول نقل کر کے دی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر بہکانے والوں کو پکڑا جائے اور بہکنے والوں کو چھوڑ دیا جائے تو پھر کوئی بھی انسان دوزخ میں نہیں جائے گا‘ کیونکہ انسانوں کو بہکانے والے شیاطین ہیں‘ اور دلیل یہ ہے کہ بہکانے والے انسان ہوں یا شیطان‘ کسی کو اپنی بات منوانے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ صرف دعوت دیتے ہیں۔ اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ان کو حاصل ہے جن کو دعوت دی جاتی ہے۔ اس لیے کوئی اپنی مرضی اور اختیار سے غلط دعوت قبول کرتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ اس مسئلہ پر ’’اسلام کا جائزہ کورس‘‘ کے پہلے سبق میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ❁❁❁

سالانہ تقریب ختم بخاری شریف

مرتضیٰ احمد اعوان

۶ فروری ۲۰۲۴ء کو کلیۃُ القرآن (قرآن کالج) لاہور میں تکمیل بخاری شریف و دستار بندی کی نویں تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقع پر طلبہ اور اساتذہ کرام کا جوش و ولولہ قابلِ دید تھا۔ جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف خان مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ اس پروگرام میں علماء کرام اور طلبہ کے والدین بھی تشریف لائے تھے۔ انتظامی کمیٹی نے تمام امور احسن انداز سے انجام دیے۔ سٹیج سیکریٹری کے فرائض کلیۃ القرآن کے استاد مولانا محمد فیاض نے سر انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز قرآن مجید کی تلاوت سے ہوا۔ یہ سعادت کلیۃ القرآن کے طالب علم حافظ محمد علی شان نے حاصل کی۔ اس کے بعد کلیہ کے ہونہار طالب علم حافظ حذیفہ افتخار نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں ہدیہ نعت پیش کیا۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ناظم اعلیٰ اور ناظم کلیۃ القرآن محترم حافظ عاطف وحید نے اپنے استقبالیہ کلمات میں تمام مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تقریب علمی‘ تذکیری‘ روحانی اور اظہارِ تشکر کا ایک ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہلِ علم کی فضیلت بہت خاص ہے۔ گویا ہم ایک مبارک اور سعید تقریب میں حاضر ہیں۔ صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے نصف صدی شہر لاہور میں قرآن حکیم کے علوم و معارف کو پھیلانے میں صرف کی‘ اور یہ اسی کا تسلسل ہے کہ یہاں اب راسخون فی العلم کی کھیپ تیار ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری کوشش کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے بقول‘ رجوع الی القرآن کورسز اہلِ علم حضرات کے لیے ایک entrance کی مانند ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ درسِ نظامی کی بھی یہی حیثیت ہے کیونکہ علم دین کا میدان بہت وسیع ہے۔ اگر کوئی انسان علم کے حصول کے بعد اس سے تغافل برتے گا تو یہ اس کے لیے خدانخواستہ liability بن سکتا ہے۔ کلیۃ القرآن میں دینی و عصری دونوں علوم کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اہمیت کے لحاظ سے دینی علوم کا پلڑا بھاری ہے۔ میں فارغ ہونے والے طلبہ اور ان کے والدین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ چونکہ دونوں تعلیمی سلسلوں کو ایک ساتھ چلانا آسان نہیں ہوتا اس لیے خاص طور پر پرنسپل صاحب اور اساتذہ زیادہ تحسین کے لائق ہیں کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری خوب نبھائی۔ کلیہ کا نیا کیمپس زیر تعمیر ہے اور وہاں ایک خوب صورت مسجد تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ الحمدللہ! اگلا مرحلہ ہاسٹل اور اکیڈیمک بلاک کی تعمیر کا ہے۔ غالب امکان ہے کہ ہماری اگلی تقریب وہاں پر منعقد ہو گی‘ ان شاء اللہ!

کلیۃ القرآن کے پرنسپل جناب ریاض اسماعیل نے ادارے کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس

وقت طلبہ کی تعداد ۹۵ جبکہ اساتذہ ۲۲ ہیں۔ان میں سے پانچ اساتذہ اسی ادارے کے فارغ التحصیل ہیں۔کلیۃ القرآن کے تعلیمی نظام کا محور قرآن حکیم ہے جبکہ تربیتی نظام نمازوں کے گرد گھومتا ہے۔طلبہ فجر کی نماز کے بعد قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں۔ناشتے کے بعد کلاسز شروع ہوتی ہیں۔پہلی شفٹ درسِ نظامی جبکہ دوسری عصری علوم کی ہوتی ہے۔کلاسز کا اختتام تین بجے ہوتا ہے۔عصر سے مغرب آرام وکھیل کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔مغرب کے بعد سے رات دس بجے تک تکرار کی کلاس ہوتی ہے۔اس مرتبہ سالانہ امتحانات میں درسِ نظامی کا رزلٹ ۸۶ فیصد رہا۔ عصری علوم میں میٹرک کا رزلٹ ۶۶ فیصد' ایف اے ۸۱ فیصد اور بی اے ۶۶ فیصد رہا۔ایم اے میں دو طلبہ پاس ہوئے۔ایک ہونہار طالب علم فضل حق نے ایک سال میں انگلش اور سیاسیات میں ماسٹرز کر کے امتیازی پوزیشن حاصل کی۔اس وقت سات طلبہ فارغ التحصیل ہو رہے ہیں۔یہاں سے مکمل فارغ التحصیل طلبہ کی تعداد اب ۷۰ ہوگئی ہے۔اس کے علاوہ ایسے طلبہ جو کلیہ میں کچھ درجے تعلیم حاصل کرنے کے بعد دوسرے مدارس سے فارغ ہوئے' ان کی تعداد ۳۰ ہے۔اس طرح ہمارے ادارے نے ایک سو عالم تیار کیے جو معاشرے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔الحمدللہ!

کلیۃ القرآن کے شعبہ عربی کے انچارج الشیخ فضل بن محمد کا تعلق تیونس سے ہے۔انہوں نے عربی زبان میں خطاب کیا جس سے محفل میں ایک سماں سا بن گیا تھا۔انہوں نے علم کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے قرآنی آیت ﴿هَلۡ يَسۡتَوِي الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴾ (الزمر:۹) اور حدیث نبوی ﷺ ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) پر مشتمل مختصر مگر جامع خطاب فرمایا۔پروگرام کو بہت عمدہ انداز میں منعقد کرنے پر پرنسپل' شرکاء اور انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا۔مولانا یوسف خان صاحب کی علمی خدمات اور تحقیقات کو بھی سراہا۔فارغ التحصیل طلبہ پر عائد ہونے والی علمی اور عملی ذمہ داریوں کا ذکر کر کے عربی کے خوبصورت اشعار پر اپنی گفتگو کا اختتام کیا۔

قرآن اکیڈمی کے استاد جناب ڈاکٹر رشید ارشد نے اپنے خطاب میں کہا کہ موجودہ دور میں بہت تبدیلیاں آ رہی ہیں۔جدید ٹیکنالوجی سے سہولیات میں اضافہ ہوا اور دینی اعتبار سے بھی کئی پہلو روشن ہوئے لیکن کچھ باتیں پریشان کن ہیں۔دین کا نظام مستند ہے' یعنی سند دین کی روایت سے ہے لیکن جدید سائبر ایج میں اسناد کی بجائے افراد کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔آج سوشل میڈیا کے ذریعے ایک فتنہ بہت زیادہ پھیل گیا ہے جس میں لوگ علماء کی توہین کرنے میں پیش پیش ہیں۔سوشل میڈیا پر علماء کی پگڑیاں اچھالی جا رہی ہیں۔یہ کام کرنے والے لوگ حبِ مال اور حبِ جاہ کی بیماری میں مبتلا ہیں۔بدقسمتی یہ ہے کہ کچھ نام نہاد علماء بھی اس فتنہ کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہم تک دین تواتر سے پہنچا لیکن اب کچھ لوگ تاریخ' تفسیر' حدیث' فقہ اور تصوف کا انکار کر رہے ہیں۔معروف قول ہے کہ اگر دنیا میں علماء نہ ہوتے تو یہ ایک اندھیر نگری ہوتی۔حدیث کی رُو سے دنیا میں لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں: عالم' متعلّم (سیکھنے والے) اور بے مایہ لوگ۔ہمیں چاہیے کہ ہم عالم بنیں یا متعلّم' تیسری قسم کے لوگوں میں شامل نہ ہوں۔

اس کے بعد دورۂ حدیث کے طلبہ کو اپنی مخصوص نشستوں پر تشریف لانے کی دعوت دی گئی۔طلبہ کی طرف

سے حافظ رضوان علی شاہ نے ترنم کے ساتھ کلیہ کا الوداعی ترانہ پیش کیا‘ جس نے ماحول کو اشک بار کر دیا۔

فارغ التحصیل سات طلبہ میں سے ایک طالب علم نے مکمل سند کے ساتھ (اپنے استاذِ حدیث سے امام بخاریؒ اوران کی روایت سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تک) صحیح بخاری کی آخری حدیث کا متن پڑھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا:

((كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ، حَبِيبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ))

(دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بڑے ہلکے ہیں‘ میزان میں بڑے وزنی ہیں‘ رحمٰن کو بڑے محبوب ہیں۔ وہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ)

جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث محترم مولانا محمد یوسف خان نے حدیث کا مطالعہ کراتے ہوئے کہا کہ یہاں موجود سب لوگ ایک مبارک مجلس میں ہیں۔ آپ کو جو باتیں سمجھ میں آتی ہیں ان پر عمل کریں اور جو باتیں سمجھ نہیں آتیں ان پر صبر کریں۔ دونوں صورتوں میں آپ کو اجر ملے گا۔ بخاری شریف میں امام بخاریؒ نے ہمیں سمجھایا کہ پورا دین وحی الٰہی کے تابع ہے۔ وحی کی دو اقسام ہیں: متلو اور غیر متلو۔ سارا قرآن وحی متلو جبکہ ساری احادیث وحی غیر متلو ہیں۔ آج تمام لوگ بشمول لبرل اور سیکولر‘ بہت پریشان ہیں کہ نئی نسل کو گمراہی سے کیسے بچائیں۔ کلیۃ القرآن بچوں کو بھٹکنے سے محفوظ رکھنے کا کام کر رہا ہے۔ سورۃ الجمعہ کی آیت ۲ کی روشنی میں چار کام ایسے ہیں جن سے نئی نسل کو گمراہی سے بچایا جاسکتا ہے: (۱) قرآن حکیم کی تلاوت (۲) تزکیۂ نفس (۳) کتاب اللہ کو سیکھنا اور سکھانا (۴) حکمت یعنی دانائی کی تعلیم۔ سب سے پہلے نئی نسل کو قرآن سے جوڑنا ہے‘ پھر ان کے نفوس کو پاکیزہ کرنا‘ یعنی ان کے اندر بری سوچوں‘ رویوں اور عادات کو نکالنا اوران کی جگہ اچھی چیزیں پیدا کرنا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے گمراہی سے بچنے کا حل بتایا کہ ’’میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں‘ اگر ان کو تھام کر رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے‘ یعنی قرآن اور سُنّت‘‘۔ چنانچہ جس شخص کا عمل قرآن وسُنّت کے مطابق ہوگا وہ ہرگز گمراہ نہیں ہوگا۔ بنیادی چیز نیت کا درست ہونا ہے۔ ہمیں وحی الٰہی پوری سند کے ساتھ ملی ہے۔ ہمارے ہاں وہی استاد حدیث کا علم پڑھا سکتا ہے جو اپنی ذات سے رسول اللہ ﷺ تک پوری سند بیان کرسکتا ہو۔

پروگرام کے آخر میں صدر انجمن خدام القرآن ڈاکٹر عارف رشید نے اپنے مختصر خطاب میں فرمایا کہ میں سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں‘ پھر اساتذہ کرام کا اور خاص طور پر مولانا یوسف خان صاحب کا‘ کیونکہ ان کا ہمارے اوپر بڑا احسان ہے کہ اپنی بے شمار مصروفیات میں سے وقت نکال کر تشریف لائے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔ یہاں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کی تعلیم بھی دی جاتی ہے جو اس ادارے کا ایک امتیازی وصف ہے۔ آپ سب اپنی دعاؤں میں والد محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور علماء کرام کو ضرور یاد رکھیے گا۔ اس کے بعد مولانا محمد یوسف خان صاحب اور اساتذہ کرام نے فاضلین کی دستار بندی کی اور دعا پر تقریب کا اختتام ہوا۔ ۞۞۞

سائنسی علوم کی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت (۵)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

عقیدۂ توحید کے مضمرات کا انکار

تیسرا مغالطہ اس میں یہ ہے کہ آپ اسلام کے بنیادی معتقدات کے ساتھ جیسا برتاؤ بھی چاہیں کریں‘ جب چاہیں انہیں چھوڑ دیں یا معطل اور خارج از عمل کر دیں اور جب چاہیں انہیں اختیار کر لیں‘ مؤثر بنا دیں اور عمل میں لے آئیں۔ ایک کوٹ اور سوئٹر کی طرح جب چاہیں انہیں پہن لیں اور جب چاہیں مصلحت یا موسم یا نزاکت طبع کے تقاضا سے اتار کر رکھ دیں‘ آپ ویسے کے ویسے ہی مسلمان رہیں گے۔ یہ خیال درست نہیں۔ ہمارے بعض سائنس دانوں کا خیال یہ ہے کہ سائنسی تحقیق نماز کی طرح کی کوئی چیز نہیں کہ اس میں خدا کے عقیدہ کو پیش پیش رکھا جائے یا خُدا کے عقیدہ کے مضمرات کی روشنی میں جاری رکھا جائے۔ لیکن ہم یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ سائنسی تحقیق مظاہرِ قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ تعجب ہے کہ ہمارا خُدا تو یہ کہے کہ مظاہرِ قدرت خُدا کی ہستی اور صفات کی نشانیاں ہیں اور ان کا مشاہدہ اور مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرو اور ہم صاف کہہ دیں کہ ”نہیں تو‘ یہ کیسے ہو سکتا ہے! خُدا کی صفات کا مظاہر قدرت سے کیا تعلق؟“ اور پھر بھی ہمارے اعتقاد یا ایمان میں کوئی فرق نہ آئے‘ یہاں تک کہ ہمیں توبہ کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ ہو۔ یہ ایمان بھی بی بی تمیز کے وضوئے محکم کی طرح ہے جو کسی حالت میں بھی ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ مسلمان کو تو یہ حکم ہے کہ وہ خُدا کے عقیدہ کو اپنی پوری عملی زندگی کی قوتِ محرکہ بنائے‘ جو ہر چھوٹے بڑے کام میں اس کی راہ نمائی کرے۔ اُٹھتے بیٹھتے‘ چلتے پھرتے اور لیٹے یا کھڑے ہو کر‘ کسی وقت بھی خُدا کو نہ بھلائے۔ ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھے تاکہ اسے معلوم رہے کہ ہر کام خُدا کے حکم کے مطابق اور خُدا کی رضامندی کے لیے کرنا ہے۔ یہاں تک کہ برتن ڈھانپے تو خُدا کا نام لے‘ چراغ بجھائے تو خُدا کا نام لے‘ کسی چٹان یا پہاڑ کے پاس سے گزرے تو خُدا کا نام لے۔ اِن احکام کے پیشِ نظر سائنس کی تحقیق یا تعلیم کے وقت عمداً خُدا کے نام کو حذف اور خُدا کے عقیدہ کو معطل کر دینا اسلام کے مقاصد کے مطابق کس طرح سے ہے۔ پھر جو شخص سائنسی تحقیقات یعنی مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے وقت خُدا کا نام تو لیتا ہے لیکن قرآن کی تعلیمات کے مطابق مظاہرِ قدرت کے اندر خُدا کی صفات کو سمویا ہوا نہیں مانتا وہ خُدا کے اعتقاد کے مضمرات کا جیسا کہ قرآن نے ان کی تشریح کی ہے‘ منکر نہیں تو اور کیا ہے؟

سائنسی تحقیق کو عقیدۂ توحید کی روشنی سے محروم کر دینا
نہ صرف سائنس کو غلط کر دینا بلکہ اپنی عملی زندگی کو بھی غلط راستے پر ڈال دینا ہے

اصل بات یہ ہے کہ کسی سائنسی تحقیقات کے وقت خدا کے عقیدہ کو پیش پیش رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز کے وقت۔ کیونکہ سائنسی تحقیق میں آپ کی مصروفیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ وہ مشین تیار کر رہے ہیں جو فرد اور قوم کی پوری زندگی کو حرکت میں لائے گی۔ وہ مشین آپ کی قوم کا علم ہے۔ ہر قوم کا عمل اس کے علم کائنات پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر ہم علم سے خدا کے عقیدہ کو خارج کر دیں گے تو ضروری ہے کہ وہ قوم کی پوری عملی زندگی سے خارج ہو جائے۔ اگر کسی قوم کا علم لادینی ہے تو اس کی عملی زندگی بھی لادینی ہوگی۔ مسلمانوں کا دینی اور اعتقادی انحطاط ہی ان کے مجموعی انحطاط کا باعث ہوا ہے۔ اسی سے ان کی وحدت اور یک جہتی کا انحطاط‘ ان کا اقتصادی انحطاط‘ سیاسی انحطاط‘ اخلاقی انحطاط اور ان کے انحطاط کی اور تمام قسمیں پیدا ہوئی ہیں‘ لیکن مسلمانوں کے دینی اور اعتقادی انحطاط کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انہوں نے عیسائی مغرب کی کورانہ تقلید میں علم یا سائنس سے خدا کا عقیدہ خارج کر دیا ہے۔ علم کے بگڑنے اور سنورنے سے ہی ذہن بگڑتے اور سنورتے ہیں۔ جب ذہن بگڑتے ہیں تو عمل بھی بگڑتا ہے اور جب ذہن سنورتے ہیں تو عمل بھی سنورتا ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن حکیم کی اس آیت کا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ ﴾ (الرعد:۱۱)

’’بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک ان کے ذہنوں میں تغیر نہ آجائے۔‘‘

علم سے خدا کا عقیدہ خارج کر دینے کے بعد یہ شکایت کرنا کہ ہماری عملی زندگی میں خُدا کا عقیدہ باقی نہیں رہا‘ عبث ہے۔

جس طرح سے کائنات کے طبیعیاتی اور حیاتیاتی طبقے خُدا کی خالقیت اور ربوبیت کے مظاہر ہیں‘ اسی طرح سے کائنات کا نفسیاتی اور انسانی طبقہ بھی خُدا کی خالقیت اور ربوبیت کا مظہر ہے۔ تاہم جس طرح سے ہمارے طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم خدا کے تصوّر سے محروم ہیں‘ اسی طرح سے ہمارے وہ سائنسی علوم بھی جنہیں انسانی علوم کہا جاتا ہے خُدا کے عقیدہ سے بے تعلق ہیں۔ اور یہی علوم ہیں جو انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے فلسفے ہیں۔ جب ہمارے فلسفۂ سیاست‘ فلسفۂ اخلاق‘ فلسفۂ اقتصادیات‘ فلسفۂ قانون‘ فلسفۂ تعلیم اور فلسفۂ تاریخ میں خُدا کے عقیدہ کے لیے کوئی جگہ نہ بن سکے تو کیسے ممکن ہے کہ ہماری عملی زندگی میں‘ جو ہمارے سیاسی‘ اخلاقی‘ اقتصادی‘ قانونی اور تعلیمی اعمال وافعال پر مشتمل ہوتی ہے‘ خُدا کے عقیدہ کی کوئی گنجائش نکل آئے۔ جب ہماری عملی زندگی کا کوئی پہلو بھی ہمارے اپنے ہی کیے کی وجہ سے خُدا سے متعلق نہیں ہو سکتا تو اس بات کی شکایت کیا معنی رکھتی ہے کہ ہم خُدا سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ اس کی عملی زندگی کے کسی حصّہ میں بھی نظریاتی غیر جانبداری (neutrality) ممکن نہیں۔ اگر وہ اپنی سائنسی تحقیق سے سچّے خُدا کو خارج کرے گا تو اسے وہاں اس کے بجائے شعوری یا لاشعوری طور پر کسی جھوٹے خُدا یا بُت کو رکھنا پڑے گا‘ اور پھر اس کا جھوٹا خدا یا بُت اس کی سائنس کو سائنس کے پایہ سے گرا دے گا۔ زمانہ حال میں اس بُت کو کہیں اشتراکیت کا نام دیا جاتا ہے‘ کہیں لادینی

وطنیت اور قومیت کا اور کہیں لا دینی جمہوریت کا‘ کیونکہ دل کا خانہ کبھی خالی نہیں رہتا۔ جب تک بتوں سے کفر نہ کیا جائے خُدا پر ایمان لانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن خُدا پر ایمان لانے سے پہلے بتوں سے کفر کرنے پر زور دیتا ہے۔

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾

(البقرة: ۲۵۶)

’’جو شخص بتوں سے کفر کرتا ہے اور اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ بیشک ایک مضبوط حلقہ کو تھام لیتا ہے۔‘‘

عیسائی مغرب کی کورانہ تقلید سے باز آنے اور قرآن کے فلسفہ سائنس کی طرف جلد از جلد رجوع کرنے کے بجائے ہم اپنی اس ہمالیہ جتنی بڑی غلطی کی تلافی اس طرح سے کر رہے ہیں کہ ہم نے لا دینی سائنسی علوم کے ساتھ ایک اور مضمون کا جسے دینیات یا اسلامیات کہا جاتا ہے‘ اضافہ کر دیا ہے اور علومِ اسلامیہ کی الگ درسگاہیں‘ سوسائٹیاں اور انجمنیں دارالعلوم اسلامیہ اور مؤتمر علوم اسلامیہ ایسے ناموں کے ساتھ قائم کر دی ہیں۔ اس کا اُلٹا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن میں یہ خیال اور بھی راسخ ہو گیا ہے کہ اسلام اصل علم سے الگ کوئی چیز ہے اور علومِ اسلامیہ کا تعلق کسی حالت میں بھی سائنسی علوم سے نہیں۔

خُدا کی خالقیت اور ربوبیت سے انکار

حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمان سائنس دان یا فلسفی جو اپنے پورے اختیار کے ساتھ خُدا کے عقیدہ سے الگ ہو کر یا اس کے علمی اور تحقیقی تقاضوں کو نظر انداز کر کے سائنس یا فلسفہ کی تعلیم اور تحقیق میں مصروف ہوتا ہے اگر ہم اس کی نفسیات کو ذرا بغور دیکھیں تو ہمیں صاف نظر آ جائے گا کہ یہ کہنا اس کے ساتھ بے انصافی ہرگز نہیں کہ اسے اسلام کے خدا پر یقین ہی نہیں رہا۔ تاہم وہ خُدا کے سچّے عقیدے سے الگ ہوتا ہے تو اس کی جگہ ایک اور غلط عقیدہ کو قبول کرتا ہے۔

تمام علمی سچائیوں کو روشن کرنے والی حقیقت

فلسفی اور سائنس دان سچائیوں کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اگر ایک ایسی سچائی جو قطعی اور یقینی طور پر سچائی ہو اور جس کے غلط ہونے کا کوئی بھی امکان نہ ہو کسی فلسفی یا سائنس دان کے ہاتھ لگ جائے تو وہ نعمت عظمیٰ سمجھ کر اس سے چمٹ جاتا ہے‘ کیونکہ وہ اسے اور سچائیوں کی جستجو میں مدد دیتی ہے اور اس کے لیے ایک روشنی کا مینار بن جاتی ہے جس سے علم کا نور دُور دُور تک پھیل جاتا ہے اور دوسری سچائیوں کو روشن کرتا جاتا ہے۔ سائنسی تحقیق کا کوئی نتیجہ اگر اس کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو تو وہ یقینی طور پر صحیح جان کر قبول کر لیا جاتا ہے اور اگر مطابقت نہ رکھتا ہو تو بوثوق تمام غلط سمجھ کر ردّ کر دیا جاتا ہے۔ فرض کیا کہ کسی ایسے ذریعۂ علم سے جو بالاتفاق اور مسلّم طور پر آنکھوں کے دیکھنے سے بھی ہزار گنا زیادہ قابلِ اعتماد ہے‘ سائنس دانوں کے گروہ کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ خُدا فی الواقع موجود ہے اور وہ اس کائنات کا خالق اور ربّ ہے اور اس کی صفاتِ خالقیت اور ربوبیت اس کائنات میں سموئی ہوئی ہیں‘

تو پھر کیا یہ ممکن ہے کہ ان کی سائنسی تحقیق اس حقیقت کی راہ نمائی کے بغیر ایک قدم بھی آگے اُٹھا سکے؟ یقیناً وہ اسے اپنی سائنسی تحقیق کی بنیاد یا کلید کا درجہ دیں گے اور اسے سب سے بڑی سچائی سمجھیں گے۔ لیکن عیسائی مغرب کے سائنس دانوں کے نزدیک خُدا کا تصوّر اس درجہ کی یقینی اور قطعی حقیقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو اپنی سائنسی تحقیق کے لیے مشعل راہ نہیں بناتے۔ خُدا کے تصوّر کو سائنسی حقیقت سے بالاتر اور زیادہ یقینی اور زیادہ قابلِ اعتماد کسی حقیقت کا مقام دینا تو درکنار وہ ابھی اسے معمولی سائنسی حقیقت کا مقام بھی نہیں دیتے بلکہ اسے سائنس کے منافی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسے اپنی سائنسی تحقیق کی بنیاد کیسے بنا سکتے ہیں۔ البتہ مسلمان تو یہ مانتا ہے کہ خُدا کا تصوّر فی الواقع سائنسی حقیقت سے بھی بالاتر مقام رکھنے والی قطعی اور یقینی حقیقت ہے اور اسی یقین کی وجہ سے وہ مسلمان ہے۔

خلافِ قرآن عقیدہ

پھر اگر کوئی فلسفی یا سائنس دان ایسا ہو جو اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود مغربی عیسائی سائنس دانوں کی تقلید میں خُدا کے عقیدہ کو فلسفہ اور سائنس سے بے تعلق یا فلسفہ اور سائنس کے منافی خیال کرتا ہو تو کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس نے قرآن کی تعلیمات کے خلاف ایک نیا عقیدہ بنا لیا ہے؟ اس کے نزدیک خُدا کا تصوّر تمام سچائیوں کو روشن کرنے والی سچی حقیقت نہیں اور وہ اسلام کے خُدا کو اس طرح سے نہیں مانتا جس طرح سے اسلام اس سے توقع رکھتا ہے۔ ورنہ خود فلسفہ اور سائنس ہی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ خُدا کے عقیدہ کو فلسفہ اور سائنس کی راہ نما حقیقت کے طور پر کام میں لاتا اور اس کی روشنی میں فلسفہ اور سائنس کی صداقتوں کی کامیاب جستجو کرتا۔ (جاری ہے) ❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن، دروسِ قرآن، دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نام کتاب : ستاروں کے جگر چاک

ترتیب وتالیف : محمد عدیل سلطان

ضخامت:۸۴۸ صفحات قیمت:3000روپے ناشر:قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل‘لاہور

یہ کتاب ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی تحقیقی خدمات کے حوالے سے مرتب کی گئی ہے۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر دورِ حاضر کی ایک عظیم شخصیت ہیں۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں کیونکہ علمی میدان میں ان کے کارنامے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے دنیا کے کئی ممالک کے بامقصد دورے کر کے اپنی قابلیت میں گراں قدر اضافے کیے۔ وہ دنیائے اسلام کی قدیم ترین یونیورسٹی جامعہ الازہر میں بھی تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک نیز جاپان‘ جرمنی‘ فرانس‘ سوئٹزرلینڈ‘ یونان‘ سپین میں بھی اپنی تحقیق کو متعارف کرایا۔ حکومت ایران نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں ’’لوحِ تقدیر‘‘ کا اعزاز دیا۔ حال ہی میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبہ اردو کو ادارے کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ایک مختصر سی مدت میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے اردو کی خدمات میں گراں قدر اضافے کیے۔ ڈاکٹر صاحب کی انتظامی صلاحیتیں بھی کچھ کم نہیں۔ انہوں نے یونیورسٹی میں بہت کم بجٹ کے باوجود ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے۔ صرف تین ماہ کے عرصے میں وہ کام انجام دیے جو سالوں میں نہ ہو سکے تھے۔ تعلیمی میدان کی متعدد معروف شخصیات نے ڈاکٹر صاحب کے کام کو سراہا ہے۔ اُن میں سے ڈیڑھ سو سے زائد افراد کی آراء اس کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ چند اصحاب نے ہدیہ عقیدت اشعار کی صورت میں پیش کیا ہے جبکہ کچھ نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے انگریزی زبان اختیار کی ہے۔

ڈاکٹر زاہد منیر کی خدمات کا اعتراف چند صفحات میں ممکن نہیں۔ انہوں نے تاریخ‘ تنقید اور شخصیت شناسی کے تحت کثیر مضامین لکھے۔ ان کی ریسرچ کے کارنامے برصغیر کے علاوہ کئی دوسرے ممالک تک بھی پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب کی چند تحقیقی تحریریں عربی‘ فارسی‘ ترکی اور اطالوی زبان میں بھی ہیں۔

’’ستاروں کے جگر چاک‘‘ حسن معنوی کے علاوہ دیدہ زیب ٹائٹل اور خوبصورت جلد میں پیش کی گئی ہے۔

(۲)

نام مجلہ : ماہ نامہ ’’محدث‘‘

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر حافظ عبدالرحمٰن مدنی

زرسالانہ: ۱۲۰۰ روپے مقامِ اشاعت :۹۹- جے‘ ماڈل ٹاؤن‘ لاہور

زیر تبصرہ مجلہ ماہنامہ ’’محدث‘‘ کا جنوری ۲۰۲۳ء کا خصوصی شمارہ ہے جسے ’’ٹرانس جینڈر ایکٹ نمبر‘‘ کا عنوان دیا گیا ہے۔ ٹرانس جینڈر ایکٹ ۲۰۱۸ء میں پاس ہوا جس کے تحت کسی مرد یا عورت کا صنف تبدیل کرنا جائز ہوگا۔ وہ اپنے اس فیصلے کو نادرا کے دفتر میں درج کرا سکتا ہے۔ چونکہ یہ ایکٹ ان معاشروں سے لیا گیا ہے جہاں حیا کا تصور نہ ہونے کے برابر ہے اور کسی بھی مرد اور عورت کے لیے آزادی کے نام پر کچھ بھی کرنے پر پابندی نہیں‘ اس لیے یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ایک سازش ہے تاکہ مسلمانوں کا خاندانی نظام بھی ختم ہو جائے۔

یہ شمارہ اپنے موضوع پر جامعیت رکھتا ہے۔ اس کے چند عنوانات اس طرح ہیں:

☆ ۲۰۱۸ء کے نام نہاد حفاظتی ایکٹ کی فریب کاری

☆ صنفی شناخت‘ حقوق اور ٹرانس جینڈر

☆ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات

☆ پاکستان شریعت کونسل کا تجزیہ و تجاویز

☆ صنفی تبدیلی کے تحفظ کا قانون اور دینی حلقے

☆ انٹرسیکس اور ٹرانس جینڈر

☆ بدلتے سماجی رویے اور ہماری ذمہ داریاں

یہ جریدہ قابلِ قدر معلومات پر مشتمل ہے۔ موضوع کے ساتھ دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک عمدہ دستاویز ہے۔ اس شمارے میں صحیح بخاری کی کتاب التوحید کی تشریح پر ایک وقیع تحریر شامل ہے۔ اسمائے الٰہی رحیم اور رحمٰن کی توضیح کے علاوہ اس مسئلے کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ ’رحمت‘ اللہ کی ذاتی صفت ہے یا مخلوق! ❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

punishment decreed by Allah *(SWT)*, the generation born in the wilderness reached maturity. They waged war against the inhabitants of Palestine, conquering the land. The first city to fall was Jericho. They were instructed to enter as conquerors but with humility, not with heads held high and necks straight – a stark contrast to the typical arrogance displayed by conquerors. This directive parallels the humility shown by the Prophet *(SAAW)* upon entering Makkah at the time of its conquest, when his forehead touched the front wood of the saddle of his she-camel *Al-Qaswa* he rode with profound humility and gratitude to Allah *(SWT)*.

Verse 162

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ﴿١٦٢﴾

But those who wronged among them changed [the words] to a statement other than that which had been said to them. So We sent upon them a punishment from the sky for the wrong that they were doing.

The verse highlights the persistent defiance and rebellion of the Israelites in the face of Allah's *(SWT)* blessings, leading to their ultimate destruction. The wrongdoers among them deviated by uttering statements contrary to what had been ordained by Allah *(SWT)*. Consequently, Allah *(SWT)* unleashed a scourge, a torment from the sky, as a retribution for their transgressions and wicked deeds, resulting in the annihilation of the rebels.

===================================

And Allah *(SWT)* Knows Best!

sky was covered with clouds such that they were protected from the scorching heat of the sun. Third, a unique meal, consisting of manna and quails *(Mann-o-Salwa)* was sent down on them. Had this Divine arrangement, catering as it did for the millions of wandering Israelites' basic necessities of life, not been made, they would certainly have perished. Nevertheless, those who displayed ingratitude and transgressed not only erred in their disobedience to Allah *(SWT)* and His Messengers *(AS)* but also inflicted harm upon themselves. It is crucial to acknowledge that their actions could not inflict any harm upon the Almighty *(SWT)*; rather, the repercussions were borne by the individuals themselves who deviated from the righteous path.

Verse 161

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

And [mention, O Muhammad], when it was said to them, "Dwell in this city [i.e., Jerusalem] and eat from it wherever you will and say, 'Relieve us of our burdens [i.e., sins],' and enter the gate bowing humbly; We will [then] forgive you your sins. We will increase the doers of good [in goodness and reward]."

The incidents recounted here draw from the history of Bani Israel, which has been extensively discussed in Surah Baqarah. However, it's noteworthy that this Surah predates the revelation of Surah Baqarah; it is of Makki origin. The events are presented as if they are well-known facts, reflecting the Jews' familiarity with their own history. Recall the command given to them: "Inhabit this town, partake freely of its provisions, and say, 'Hittatun, Hittatun, O Allah *(SWT)*, forgive our sins.'" They were commanded that when entering the city, they must lower their heads humbly, not arrogantly, as conquerors might enter other cities. The promise is made that if they follow these instructions, seeking forgiveness and entering with humility, Allah will pardon their wrongdoings and reward the virtuous among them. Thy would have attained the elevated status of Ihsan.

According to Jewish history, this town was Jericho (Ariha). After the passing of Prophet Moses *(AS)* and the completion of the forty-year

The reference here pertains to the People of the Book, specifically the Jews, during the eras of Prophet Moses *(AS)* and Holy Prophet *(SAAW)*. It is expounded that within the community of Prophet Moses *(AS)*, as well as in subsequent times, there have been individuals who embody piety and refrain from transgression. Not all of them have deviated; indeed, a segment among them adheres to the path of righteousness. An exemplar of this is Abdullah ibn Salam *(RA)*, a prominent Jewish scholar who embraced Islam in Madinah and became a companion of the Holy Prophet *(SAAW)*. Thus, there existed individuals who, grounded in truth, upheld justice. It is essential to note that the Truth has remained constant throughout human history, with all Messengers of Allah propagating the same Deen. The righteous path has been unchanging, and the divine revelations consistently conveyed the fundamental message of monotheism, prophethood, and the afterlife.

Verse160

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۭ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ
فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ
الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝١٦٠

And We divided them into twelve descendant tribes [as distinct] nations. And We inspired to Moses when his people implored him for water, "Strike with your staff the stone," and there gushed forth from it twelve springs. Every people [i.e., tribe] knew its watering place. And We shaded them with clouds and sent down upon them manna and quails, [saying], "Eat from the good things with which We have provided you." And they wronged Us not, but they were [only] wronging themselves.

This refers to the organization of the people of Israel which has been mentioned in the Qur'an *(Surah Al-Ma'idah, Verse 12)*. This organization was one of the numerous favours which Allah *(SWT)* had bestowed upon the Israelites. Mention is made of three other favours bestowed upon them. First, an extraordinary arrangement for their water supply was made in the otherwise arid Sinai Peninsula. Second, the

Verse 158

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ
وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

Say, [O Muhammad], "O mankind, indeed I am the Messenger of Allah to you all, [from Him] to whom belongs the dominion of the heavens and the earth. There is no deity except Him; He gives life and causes death." So believe in Allah and His Messenger, the unlettered prophet, who believes in Allah and His words, and follow him that you may be guided.

Allah *(SWT)* commands the Holy Prophet *(SAAW)* to declare to the Israelites (the people of the Book) that he is the Messenger *(SAAW)* of Allah *(SWT)* to all of humanity – present, past and future – to all of creation till the Day of Judgement. The Holy Prophet *(SAAW)* bears the message from the sole Sovereign and Owner of the heavens and the earth, to whom all dominion belongs. There is no deity except Him. He is the Giver of life and the Bringer of death. This declaration is directed primarily to the people of the Book; however, it extends to all of humankind, therefore, we must all place trust and faith in Allah *(SWT)* and His Messenger *(SAAW)*.

The salvation for the world is conditional on unwavering belief in the "unlettered" Prophet *(SAAW)*, who himself places unwavering belief in Allah and fully embraces the words revealed to him by Allah *(SWT)*, acknowledging their divine origin. Foremost, the Prophet *(SAAW)* holds steadfast faith in the Quran, recognizing it as the revelation from Allah *(SWT)*. Those who follow him, and who adhere to the guidance sent with him shall find the path of true righteousness. In doing so, they will be rightly guided, and only then will their journey be illuminated by the divine wisdom and guidance bestowed upon the Prophet *(SAAW)*.

Verse 159

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝

And among the people of Moses is a community which guides by truth and by it establishes justice.

been placed on them by the legal hair-splitting of their jurists, the pietistic exaggerations of their spiritual leaders, the introduction of superstitions and self-contrived laws and regulations by their masses. The Prophet *(SWT)*, by relieving them of every unnecessary burden and releasing them from every unjustified restriction, in fact liberated their shackled lives.

It is incumbent upon us, in the present day, to engage in critical introspection and evaluate our alignment with the four criteria for success delineated in the concluding part of this verse. We must scrutinize whether we are fulfilling these essential dimensions of our relationship with our beloved Prophet *(SAAW)* as Muslims. The foundational pillars of our connection with the Prophet Muhammad *(SAAW)* are multifaceted. Firstly, unwavering belief in the Messenger of Allah *(SAAW)* necessitates complete submission and obedience to the divine revelations he brought – namely, the Qur'an and the Sunnah. The second imperative of this faith is profound and unequivocal: true faith, or Iman, demands that one holds the Prophet *(SAAW)* in higher esteem and honor than even one's closest kin–father, son, and all other human relationships. This reflects in absolute obedience and a love that transcends familial bonds. Another facet involves active support for the Prophet *(SAAW)* and his mission. His objective was not personal aggrandizement but rather the fulfilment of a divine mission entrusted by Allah *(SWT)*. The support for this mission extends beyond his lifetime and persists until the Day of Judgment. We must conscientiously assess whether we are living in alignment with this purpose.Moreover, Prophet Muhammad *(SAAW)* sought no personal assistance for trivial matters; his appeal was for support in establishing the Deen of Allah *(SWT)*. The third aspect, therefore, is a commitment to assisting in his noble mission. The fourth dimension underscores the importance of adhering to the divine light – the Final Testament – sent by Allah in the form of the Holy Qur'an. This involves a dedicated following of the teachings encapsulated within this sacred scripture.

Therefore, we should pray to Allah *(SWT)* to include us in this group and determine to tread this path, committing to fulfill these four fundamentals of our relationship with Prophet Muhammad *(SAAW)*.

meaningless unless one supports the struggle to establish the hegemony of truth which was being carried on under the leadership of the Prophet *(SAAW)*. For unless one spends money to exalt the word of Allah *(SWT)*, the very foundation of Zakah is lacking, even if a person spends huge amounts in the way of charity. They were also reminded that they had been told in the past that Allah's *(SWT)* mercy was exclusively for those who believed in His Revelation. Now those who rejected the Revelation received by Prophet Muhammad *(SAAW)* could never be considered believers in Revelation no matter how zealously they claim to believe in the Torah.

Reference to the Prophet *(SAAW)* in this verse as "Ummi"is significant for two reasons Prophet Muhammad *(SAAW)* was raised from among the Umiyeen (gentiles) as the Israelites branded all other nations as Gentiles (ummis). Steeped in racial prejudice, the Israelites did not consider members of other nations as their equals, let alone accept any person not belonging to them as a Prophet *(AS)*. The Qur'an also states the Jewish belief that they would not be taken to ask for whatever they might do to non-Jews. *(Ref: Surah Al-e-Imran, verse 75)*. Employing the same term which they themselves had used, the Qur'an tells them that their destiny was linked with the "ummi" Prophet *(SAAW)*. By obeying him they would become deserving of Allah's *(SWT)* mercy. As for disobedience to the Prophet *(SAAW)*, it would continue to arouse Allah's *(SWT)* wrath which had been afflicted upon them for centuries. Furthermore, the term "ummi" may signify being "unlettered", as exemplified by the Prophet Muhammad*(SAAW)*, who, too, remained "uneducated" in the conventional sense, having not undergone formal instruction in this worldly realm. However, it is essential to recognize that Allah *(SWT)*, in His divine wisdom, bestowed upon His Messenger*(SAAW)* prodigious knowledge and guidance, which is beyond our limited comprehension, as He *(SWT)* deemed suitable.

It must also be noted that the Shariah of Prophet Muhmmad *(SAAW)* declares the pure things as lawful which the Israelites had forbidden, and the impure things which they had legitimized as lawful. The Israelites had fettered their lives by undue restrictions which had

The verse explains that it is false to assume that the general rule underlying Allah's *(SWT)* governance of His realm is that of wrath which is occasionally tempered with mercy and benevolence. On the contrary, the general rule is that of mercy and benevolence and wrath is the exception which is aroused when man's transgression and rebellion exceed all reasonable limits.

Verse 157

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ
وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

Those who follow the Messenger, the unlettered prophet, whom they find written [i.e., mentioned] in what they have of the Torah and the Gospel, who enjoins upon them what is right and forbids them what is wrong and makes lawful for them the good things and prohibits for them the evil and relieves them of their burden and the shackles which were upon them. So they who have believed in him, honored him, supported him and followed the light which was sent down with him – it is those who will be the successful.

The preceding verse concludes Allah's *(SWT)* response to Prophet Moses' *(AS)* prayer. This was the appropriate moment to invite the Israelites to follow the Message preached by the Prophet Muhammad *(SAAW)*. The upshot of what is being said here is that people can even now attain Allah's *(SWT)* mercy exactly as they could in the past. These conditions require that people should now follow the Prophet Muhammad *(SAAW)*, since refusal to follow a Prophet *(AS)* after his advent amounts to gross disobedience to Allah *(SWT)*. Those who do not commit themselves to follow the Prophet *(SAAW)* cannot attain the essence of piety, no matter how hard they try to make a pretence of it by observing the minor details of religious rituals generally associated with piety.

Likewise, the Israelites had been told that paying Zakah was essential to win Allah's *(SWT)* mercy. However, payment of Zakah is

Allah *(SWT)*. That was for the collective repentance of the entire folk. When a people are put to the test it is an occasion of crucial importance for it helps to distinguish the righteous from the wicked. Like a winnow, it separates out of the mass the useful from the useless. Hence in His wisdom Allah *(SWT)* subjects people to tests. Those who successfully pass through them, owe their success to the support and guidance they receive from Allah *(SWT)*. As for those who are unsuccessful, their failure is the result of their not receiving that support and guidance. This does not detract from the fact that men neither arbitrarily receive or are denied Allah's *(SWT)* support and guidance. Both extending and withholding support and guidance follow a rule which is based on wisdom and justice. The fact, however, remains that man can succeed in the test to which he is put only if Allah *(SWT)* supports and guides him.

<u>Verse 156</u>

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ
وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

And decree for us in this world [that which is] good and [also] in the Hereafter; indeed, we have turned back to You." [Allah] said, "My punishment – I afflict with it whom I will, but My mercy encompasses all things." So I will decree it [especially] for those who fear Me and give zakah and those who believe in Our verses –

The verse encapsulates a profoundly significant supplication from Prophet Moses *(AS)*, urging believers to direct their countenances solely towards The Lord *(SWT)* and to recommit as His *(SWT)* devoted servants and slaves. Allah *(SWT)* responds to this entreaty by expounding upon three crucial points. First and foremost, regarding His *(SWT)* punishment and retribution, it is reserved for those who, through their transgressions, have become deserving of it and persist in impenitence. Second, His *(SWT)* mercy extends to all of creation, constituting the very essence of existence. Nevertheless, a distinctive mercy awaits those who exhibit exceptional piety, steadfastly observe their prayers, engage in acts of charity, and harbor a profound fear of Allah *(SWT)*, unwaveringly believing in His *(SWT)* revelations.

As delineated in verse 150 of the Surah, Prophet Moses *(AS)* received revelation from Allah *(SWT)* while atop Mount Toor, conveying that his nation had deviated from the righteous path. Upon Prophet Moses' *(AS)* return from Mount Toor, a profound anger and sorrow enveloped him as a consequence of his people's lamentable transgressions. He reproached them sternly for their grievous sins. Subsequently, when the severity of Prophet Moses' *(AS)* anger abated, he retrieved the tablets of the Torah, once cast to the ground in frustration.

Within the inscriptions of these Tablets is contained guidance and mercy, a source of illumination for those who held awe and reverence for Allah *(SWT)* within their minds and hearts. It is imperative to recognize that, analogously, the Qur'an serves as a beacon of guidance for those who harbor a profound fear of Allah *(SWT)* and are conscientiously attuned to His majesty. Only individuals characterized by a genuine reverence for Allah *(SWT)* can truly extract benefit from the profound guidance encapsulated in the Qur'an, much like those who, in the case of the Torah, bore a deep reverence for the Divine.

Verse 155

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ
قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ
تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝

And Moses chose from his people seventy men for Our appointment. And when the earthquake seized them, he said, "My Lord, if You had willed, You could have destroyed them before and me [as well]. Would You destroy us for what the foolish among us have done? This is not but Your trial by which You send astray whom You will and guide whom You will. You are our Protector, so forgive us and have mercy upon us; and You are the best of forgivers.

Prophet Moses *(AS)* was summoned for the second time to Mount Sinai along with seventy chiefs of the nation in order that they might seek pardon for their calf-worship and renew their covenant with

Exposition of verses 152 – 162 of Surah Al-A'raf

Verse 152

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾

Indeed, those who took the calf [for worship] will obtain anger from their Lord and humiliation in the life of this world, and thus do We recompense the inventors [of falsehood].

The adherents of calf-worship received a divine edict and pronouncement from Prophet Moses *(AS)*, affirming that those who had embraced the veneration of the calf, deeming it a deity alongside Allah *(SWT)*, would imminently incur the wrath of Allah *(SWT)*. They were destined to endure ignominy in the transient existence of this world, subjected to the consequences dictated by Allah's *(SWT)* timeless decree of retribution for transgressors in the Hereafter.

Verse 153

وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾

But those who committed misdeeds and then repented after them and believed – indeed your Lord, thereafter, is Forgiving and Merciful.

Regarding those who had engaged in the malevolence of polytheism but subsequently repented and revitalized their faith and conviction, verily, they shall find forgiveness. Allah *(SWT)* is pardoning and compassionate towards those who sincerely repent and seek redemption for their transgressions.

Verse 154

وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿١٥٤﴾

And when the anger subsided in Moses, he took up the tablets; and in their inscription was guidance and mercy for those who are fearful of their Lord.

However, after realizing their grave mistake, some among the Bani Israel sought forgiveness and mercy from Allah *(SWT)*, acknowledging the severity of their deviation. Upon Prophet Moses' *(AS)* return, he found his people deeply engrossed in this misguided worship, leading him to express profound anger and sorrow. He confronted his appointed assistant and vicegerent, Prophet Haroon *(AS)*, reproaching him for not preventing the transgression. In his defence, Prophet Haroon *(AS)* explained that the community had overwhelmed him, and they even sought to kill him. He implored Prophet Moses *(AS)* not to allow their actions to diminish his stature and pleaded his innocence, asserting that he was not among the wrongdoers.

Strange though it may appear, the Israelites maligned the characters of those very people whom they believed to be the Messengers of Allah *(AS)* back then and they continue to do it even today. The 'Torah' in its current corrupted form is full of accusations they hurled at the Prophets and Messengers *(AS)* including such heinous allegations as polytheism, sorcery, fornication, deceit and treachery. Needless to say, indulgence in any of these sins is disgraceful for even an ordinary believer and decent human being, let alone Prophets *(AS)*. In the context of Israeli history, the denigration of their own prophets can be understood as a response to periods of religious and moral decline. During times of widespread sin and immorality among both clergy and laity, the people sought justification for their wrongdoings. To ease their consciences, they attributed the sins they were guilty of to their own prophets *(AS)*, suggesting that even these revered figures couldn't refrain from transgressions. The Qur'an, however, unequivocally rejects this distorted narrative, asserting in multiple instances that the heinous sin in question was committed by *Sāmiri*, a rebel against Allah *(SWT)*, not Prophet Haroon *(AS)*. Prophet Moses *(AS)* sought Allah's *(SWT)* forgiveness for himself and his brother, not due to any wrongdoing, but as a manifestation of humility and submission to Allah *(SWT)*. This act also served to express their disdain for the abhorrent actions of idol-worshippers, debunking the notion that the prophets themselves were culpable.

==

Recap of verses 142 – 151 (inclusive) of Surah 7, Al-A'raf

Verses 142 through 151 continue with the discourse related to an important chapter in the history of Bani Israel after their victory in the battle against Pharoah, and the ensuing journey to the Holy Land.

After the Israelites' exodus from Egypt, marking the end of slavery and the beginning of their independent nationhood, Prophet Moses*(AS)* received a divine summons from Allah *(SWT)* to Mount Toor (Sinai) to receive the Law for Bani Israel. Initially, summoned for thirty nights, the period extended to forty days and nights, during which Moses *(AS)* devoted himself to worship, fasting, meditation, and reflection in preparation for the revelation he was to receive. Before departing for Mount Toor, Prophet Moses *(AS)* advised his elder brother, Prophet Haroon *(AS)*, entrusting him with the role of vicegerent among their people. Prophet Moses *(AS)* urged Prophet Haroon *(AS)* to maintain order, avoid troublemakers, and work towards reform the community. Upon reaching the designated time and place for his conversation with Allah *(SWT)*, Prophet Moses *(AS)* expressed a deep desire to behold the divine presence. However, Allah *(SWT)* declared that Prophet Moses *(AS)* couldn't see Him directly. Instead, Allah *(SWT)* revealed a *Tajalee* (divine manifestation) upon a mountain, causing it to crumble, and Moses *(AS)* lost consciousness. Upon awakening, he humbly proclaimed Allah's *(SWT)* Glory, repenting and seeking forgiveness, acknowledging his acceptance of the truth that he couldn't see Allah *(SWT)*. Allah *(SWT)* instructed Prophet Moses *(AS)* to hold firmly to the guidance given to him, particularly the Torah received during his time on Mount Toor. The stone tablets contained details for guidance, admonitions for doing good, and avoiding evil, offering comprehensive guidance for success in this world and the Hereafter. The Israelites were urged to adhere to the Law's plain meaning, accessible to ordinary people with sound hearts and good intentions, using their common sense.

Meanwhile, during Prophet Moses' *(AS)* absence on Mount Sinai, the Israelites stayed at the mountain's foot. After Prophet Moses *(AS)* left for Mount Toor, the people began worshipping a golden calf crafted by a man named '*Sāmiri*.' Most of the Bani Israeli became deviant.

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr.Israr Ahmad

Surah Al-A'raf

(The Heights)

(Recap of verses 142 – 151of Surah,7, Al-A'raf, and exposition of Verses152 – 162 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Verse) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQur'an.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.